Rs.30/-

فروری ۲۰۱۹ء

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیات نو دہلی

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ

جریدہ حیاتِ نو

مدیر مسئول: سید راشد حامدی   **مدیر اعزازی:** ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

جلد:۴، شمارہ:۲، فروری ۲۰۱۹ء/ جمادی الاول۔ جمادی الثانی ۱۴۴۰ھ

مجلس ادارت

محمد اسماعیل فلاحی............نئی دہلی

زبیر ملک فلاحی............لکھنؤ

انیس احمد فلاحی............جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۳۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۵۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۳۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

Printed, Published & Owned by Sayyed Rashid Hamdi ,F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025.
Printed at: Ala Printing Press, 3636, Katra Dina Baig, Lal Kuan, Delhi-110006. **Published at**:F-9, Zeeshan Apartment, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025. **Editor: Ziauddin Falahi**

نقوشِ حیات

اداریہ	ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی	۳
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۳۸)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۶
واقعہ طوفانِ نوحؑ	محمد رضا ترجمہ: تنویر آفاقی فلاحی	۱۲
طلاقِ ثلاثہ: ایک علمی و تحقیقی بحث (۲)	مفتی صباح الدین ملک فلاحی قاسمی	۲۴
آزاد ہندوستان میں وقف ایکٹ	عامر جمال	۳۸
عمل صالح کی ضرورت وافادیت	فرحین اسرار	۴۶
طلبہ کے اندر علمی و تحقیقی ذوق کیسے پیدا کیا جائے؟	ذوالفقار علی فلاحی	۵۴
بزمِ ادب	تابش مہدی، سرفراز بزمی، خان محمد رضوان	۶۱
تعارف وتبصرہ	سراج احمد برکت اللہ فلاحی	۶۴
جامعہ کے لیل ونہار	مصباح الباری فلاحی	۶۹
اخبار انجمن	مصباح الباری فلاحی	۷۳

خط وکتابت وارسال زر کا پتہ

Zeeshan Apartment, F-9, 1st Floor, Near Masjid Al-Habeeb, 40 FT Road, Shaheen Bagh, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

Email: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل نمبر مدیر: +91-9927206518

دعوت اسلامی

جامعۃ الفلاح کا اختصاص ہے!

خلافتِ ارضی کی تکوین و احیاء کے لیے سب سے بنیادی ہتھیار دعوتِ اسلامی ہے۔ دعوت اسلامی، انبیائی مشن کے لیے سنگِ میل (milestone) کی حیثیت رکھتا ہے۔ انبیاء ورسل (از آدم علیہ السلام تا محمد ﷺ) نے دعوتی جد وجہد میں اپنے آپ کو کھپا دیا۔ اللہ کے ان مخلص بندوں کا ہدفِ اصلی زمین میں اللہ کی خلافت کا قیام تھا۔ خلافت کے قیام کی مختلف شکلیں متعدد انبیاء کی دعوتی زندگی میں ظہور پذیر ہوئیں اور انہیں قرآن مجید نے محفوظ کر لیا ہے۔ خلافتِ ارضی کی تکمیلی شکل وہیئت خاتم النبین حضرت محمد ﷺ نے اپنے عہد میمون میں نافذ کرنے کی آخری انسانی کوشش کر دکھائی۔ سید سلیمان ندویؒ کی ''خطباتِ مدراس'' مقصدِ بعثت نبیؐ کے جمال وکمال کی دلنشین وضاحت کرتی ہے۔

دعوتِ اسلامی ہندوستان کے مدارس اسلامیہ کے نصاب ونظام کا اختصاص (specialization) ہونا چاہیے۔ اسلام کے قلعے ہونے کے ناطے امت کی شریانوں میں خلافتِ ارضی کا مہتم بالشان انبیائی سفر اِنہی مدارس اسلامیہ کے ذریعہ قائم ودائم رہ سکتا ہے!

ہندوستان کی امتِ اسلامی کی بدنصیبی یہ رہی کی جہانبانی اور کشور کشائی کے دو قرنوں۔ قرنِ مغلیہ اور قرنِ سلطنت۔ میں بھی مدارس کے نصاب ونظام کو دعوتِ اسلامی کے نصاب ونظام کے ذریعہ ہم آہنگ وہم دوش نہیں کیا جا سکا۔ اللہ کے خلفاء: علما، صوفیاء اور سیاسی کار پردازان نے مدارس کے اندرون وبیرون میں دعوت اسلامی کے انبیائی مشن کا حق ادا نہیں کیا! جو ادا کیا جا سکتا تھا۔ بطور مثال حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے کار تجدید اور مختلف

طبقات پر ان کی سخت گیری کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستان کی امت اسلامی نے مدارس دینیہ کے تئیں یقیناً سنجیدہ غور وفکر کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس ضمن میں برصغیر ہندو پاک میں دارالعلوم دیوبند کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کرنا تاریخ کے ساتھ انصاف کرنا ہے۔ البتہ حالات کے جبر سے امت اسلامی کو نکالنے اور انبیائی مشن سے جوڑنے کے سلسلے میں اُس وژن سے کام نہیں لیا جا سکا جو زمانے کی پکار اور ضرورت تھی۔ دعوت اسلامی کو بلاشبہ نصاب میں جگہ دی گئی لیکن قرآن مجید کو نصاب میں مرکزی مقام نہیں دیا جاسکا۔ چنانچہ ''قرآنی رنگ'' میں ڈھلے ہوئے دعاۃ فراہم کرنے میں یہ ادارے آج تک ناکام ہیں۔۱۹۶۲ تک اس ملک میں مدارس کی سطح پر مختلف تجربات کیے گئے جنکا الگ سے جائزہ امت اسلامی کے دعوتی کردار کے خدوخال کی وضاحت کریگا۔

جن مدارس نے دعوت اسلامی کو اپنے قیام کا جوہری مقصود قرار دیا ان میں بلاشبہ نمایاں طور پر ''جامعۃ الفلاح'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جامعۃ الفلاح روز اول سے ہی دستوری طور پر دعوت اسلامی کو اپنا اختصاص بنا کر مدارس دینیہ کے سلسلۃ الذھب میں نمایاں مقام بنا چکا ہے۔ نصاب میں دعوت اسلامی کے اختصاص کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نصاب اقامتِ دین کی جد و جہد کا معاون و مددگار ہے، شہادتِ حق کا علم بردار ہے، معروفات کی اقامت اور منکرات کے ازالے کی جرأت پیدا کرنے والا ہے، عصرِ حاضر کے تقاضون کی رعایت کرنے والا ہے، معاصر دینی، سیاسی، معاشی، تعلیمی وتہذیبی رجحانات کو طلباء کے اندر منتقل کرنے والا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ طالب علم کو ملک و ملت کے لیے نفع بخش بنانے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ اسلامی دنیا کا مرغوب ترین اور مشکل ترین کام ہے۔ اس مشکل اور قابلِ ترجیح مرحلے سے گزر کر ہی آخرت میں فوز و فلاح کی امید کی جاسکتی ہے۔ اپنے اسی اختصاص سے محبت اور انسلاک کے نتیجہ میں جامعہ الفلاح :مفسرین، محدثین اور فقہاء کی جماعت میں اضافہ کا باعث بوجوہ نہیں بن سکا۔ لیکن لمحہ فکر یہ یہ ہے کہ کیا دعاۃ کی فراہمی کا اسکا دعوی آج تک عملی ثبوت فراہم کر سکا؟

اس تحریر کا یہ مقصد بھی نہیں کہ جامعۃ الفلاح علوم اسلامیہ کے ایوانِ ثلاثہ۔ قرآن۔حدیث اور فقہ میں بالکل درماندہ اور لاچار ہے،نہیں۔ الحمدللہ امیدوں کی شعائیں مختلف ''فلاحی ہونہاروں'' سے پھوٹ رہی ہیں۔البتہ پھر یہ خوف دامن گیر ہے کہ یہ اختصاص انہیں دعوت اسلامی کے سلسۃ الذھب سے کہیں بے گانہ یا لاتعلق نہ بنا دے کہ اختصاص کے بھی اپنے ''غرور'' ہوتے ہیں،جس کا احساس مدارس اور عصری جامعات کو بخوبی ہے!

آخرمیں زادراہ کے مصنف گرامی محسنِ جامعۃ الفلاح مولانا جلیل احسن ندویؒ (متوفی۱۹۸۱) کے انمول بول سے اس اداریے کو مہر بند کردیتے ہیں۔ایک بار شیخ التفسیر نے فرمایا:

> ''جامعۃ الفلاح دیگر مدارس کے بالمقابل ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے طلبہ واساتذہ کے پاس ایک واضح اور متعین نصب العین ہے۔خواہ وہ جماعت اسلامی سے وابستگی کی صورت میں ہو یا طلبہ کی تحریک سے تعلق کے نتیجے میں ہو،یہ سب دین ہے''۔
> (حیات نو،خصوصی اشاعت:'ہمارے اساتذہ' ص۳۱)

ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی
شعبہ اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو،علی گڑھ
(۱۰جمادی الآخر۱۴۴۰/۱۶فروری ۲۰۱۹ء)

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۳۸)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، ڈین فیکلٹی آف قرآن، الجامعہ الاسلامیہ شانتاپرم کیرلہ
ای میل: mohiuddin.ghazi@gmail.com، موبائل: 9746445135

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر ہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ اس جائزہ میں نہ کسی طرح کا احترام مانع ہونا چاہئے اور نہ کوئی نسبت حائل ہونی چاہئے، راقم کی رائے میں ہونا تو یہ چاہئے کہ ترجمہ قرآن کا کام اجتماعی طور پر اکیڈمی کی سطح پر اور متعدد بار متعدد ماہرین لغت کی نظر سے گذرنے کے بعد قابل اشاعت سمجھا جائے، اور اشاعت کے بعد بھی نظر ثانی کا کام جاری رہے۔ لیکن بوجوہ تراجم قرآن کے ساتھ ایسا اہتمام نہیں ہوسکا۔ عام طور سے ہر ترجمہ قرآن ایک انفرادی کوشش رہی ہے، اور اس لیے غلطیوں کا امکان کسی نہ کسی حد تک ہر ترجمہ میں پایا جاتا ہے۔

(۱۵۳) ایک جملہ یا دو جملے؟

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحاً وَالَّذِىْ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيْمَ وَمُوسَى وَعِيْسَى أَنْ أَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيْهِ. (الشوریٰ:۱۳)

اس آیت کا ترجمہ عام طور سے اس طرح کیا گیا ہے گویا کہ یہ ایک ہی جملہ ہے جس میں **والذی أوحینا الیک** معطوف ہے **ما وصی به نوحا** پر جو مفعول بہ ہے۔ اور **أن أقیموا الدین** بیان یا تفسیر ہے۔ اس ترجمے میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ **شرع لکم** کہنے کے بعد **والذی أوحینا الیک** کہنے کی کیا ضرورت تھی، ذیل میں مذکور ترجمے ملاحظہ ہوں:

''اسی نے تمہارے لیے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس (کے اختیار کرنے کا) نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا (وہ یہ) کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا''۔ (فتح محمد جالندھری)

''اُس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوحؑ کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسی اور عیسی کو دے چکے ہیں، اِس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اِس دین کو اور اُس میں متفرق نہ ہو جاؤ''۔ (سید مودودی)

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کردیا ہے جس کے قائم کرنے کا اس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جو (بذریعہ وحی) ہم نے تیری طرف بھیج دی ہے، اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دیا تھا، کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا''۔ (محمد جوناگڑھی)

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا اس سلسلے میں خیال یہ ہے کہ **والذی أوحینا الیک** سے دوسرا مستقل جملہ شروع ہوتا ہے۔ اس دوسرے جملے میں **والذی أوحینا الیک** مبتدا ہے، اس کے بعد جو ہے وہ اس پر معطوف ہے اور **أن أقیموا الدین** خبر ہے۔ ترجمہ دیکھیں:

''اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا جس کی ہدایت اس نے نوح کو فرمائی۔ اور

تمہاری طرف جو وحی کی ہے اور جس کی وصیت ابراہیم اور موسی اور عیسی کو کی وہ یہ ہے کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ میں نہ پڑو"۔ (امانت اللہ اصلاحی)

اس طرح اس میں دو باتیں بتائی گئیں، ایک یہ کہ جو دین آپ کو دیا گیا ہے وہ وہی ہے جو نوح کو دیا گیا تھا، اور دوسرے یہ کہ دین کے تعلق سے جو ذمہ داری آپ پر عائد کی گئی ہے وہ وہی ہے جو ابراہیم اور موسی اور عیسی پر عائد کی گئی تھی۔

اسلوب کی باریکی یہ ہے کہ لفظ والذی قرآن مجید میں عام طور سے نئے جملے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ما کے بجائے والذی لانے سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ نیا جملہ ہے۔

اس مفہوم کے بعد وہ اشکالات دور ہو جاتے ہیں، جو آیت کو ایک جملہ ماننے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان تشریحات کی بھی ضرورت نہیں رہتی ہے جو ان دونوں جملوں کو ایک جملہ مان کر کی جاتی ہیں۔

آیت مذکورہ کے ترجمے میں ایک امر اور توجہ طلب ہے وہ یہ کہ بہت سے مترجمین نے "**لا تتفرقوا فیه**" کا ترجمہ "پھوٹ نہ ڈالنا" کیا ہے جو درست نہیں ہے، کیونکہ یہ فعل لازم ہے، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ خود تفرقے میں نہ پڑو نہ یہ کہ پھوٹ نہ ڈالو۔ پھوٹ ڈالنے کے لیے باب تفعیل سے تفریق کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہاں بات تفعل سے تفرق کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب خود تفرقہ میں پڑ جانا ہوتا ہے۔

(۱۵۴)"بما عهد عندک " کا ترجمه

عہد کا لفظ عربی میں وعدے کے مفہوم کو ادا کرتا ہے، اس کے علاوہ لفظ عہد کسی چیز سے مسلسل تعلق کو بھی ظاہر کرتا ہے، شاعر کہتا ہے:

فليسَ كَعَهدِ الدارِ يا أمَّ مالكٍ * ولكنْ أحاطَت بالرِقابِ السَلاسِلُ.

اسی طرح حدیث میں ہے: **لولا قومک حدیثوا العهد بکفر...الخ**

نیچے ذکر کی گئی دونوں آیتوں میں **بما عهد عندک** سے عام طور سے وعدہ اور عہد مراد لیا گیا، ہے، مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ یہاں وہ معمول مراد ہے، جو اللہ تعالی کا حضرت موسی علیہ السلام کے ساتھ تھا، اور یہ معمول آخری عذاب سے پہلے آنے والی

نشانیوں کے سلسلے میں خود فرعون کی قوم کے سامنے واضح طور سے آچکا تھا۔

مشہور مفہوم کے تعلق سے یہ بات غور طلب ہے کہ عذاب ٹالنے اور دعا قبول کرنے کا کوئی عہد اللہ نے حضرت موسی سے کیا ہو، اس کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے، اور نہ ایسے عہد کی حضرت موسی نے قوم فرعون کو خبر دی تھی۔

اس تمہید کے بعد دونوں آیتوں کے مذکورہ ذیل ترجمے ملاحظہ فرمائیں:

(۱) وَلَـمَّا وَقَعَ عَلَيۡهِمُ الرِّجۡزُ قَالُوۡا يَا مُوسَى ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ بِمَا عَهِدَ عِندَکَ . (الاعراف:۱۳۴)

''جب کبھی اُن پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے "اے موسیٰ، تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کر''۔ (سید مودودی)

''اور جب ان پر عذاب پڑتا کہتے اے موسیٰ ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے پاس ہے''۔ (احمد رضا خان)

''اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے! جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے''۔ (محمد جونا گڑھی)

مذکورہ بالا ان تینوں ترجموں میں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ ماضی استمراری کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ یہاں کلما نہیں بلکہ لما ہے، اور جملہ میں استمرار یعنی بار بار کا مفہوم نہیں ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''اور جب آیا ان پر عذاب تو درخواست کی کہ اے موسی تم اپنے رب سے اس معمول کے واسطے سے جو اس کا تمہارے ساتھ رہا ہے، ہمارے لیے دعا کرو''۔

(۲) وَقَالُوا يَا أَيُّهَا السَّاحِرُ ادۡعُ لَنَا رَبَّکَ بِمَا عَهِدَ عِندَکَ .
(الزخرف:۴۹)

''ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے، اے ساحر، اپنے رب کی طرف سے جو منصب تجھے حاصل ہے اُس کی بنا پر ہمارے لیے اُس سے دعا کر''۔ (سید مودودی، یہاں ''ہر عذاب کے موقع پر وہ کہتے'' درست نہیں ہے، ہر عذاب کی بات نہیں ہے اور نہ ہی جملے میں استمرار کا مفہوم

ہے۔ بلکہ ایک عذاب کی بات ہے)

''اور بولے کہ اے جادوگر ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر کہ اس عہد کے سبب جو اس کا تیرے پاس ہے''۔(احمد رضا خان)

''اور انہوں نے کہا اے جادوگر! ہمارے لیے اپنے رب سے اس کی دعا کر جس کا اس نے تجھ سے وعدہ کر رکھا ہے''۔(محمد جونا گڑھی)

مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے آخری ترجمے میں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ قوم فرعون کی طرف سے مطالبہ کسی ایسی بات کی دعا کرنا نہیں تھا جس کا عہد کیا گیا ہو، بلکہ عہد کے واسطے سے عذاب کو ہٹانے کی دعا کرنے کا مطالبہ تھا۔ یعنی ''جس کا عہد کیا تھا وہ دعا کریں'' یہ مراد نہیں ہے، مراد یہ ہے کہ جو عہد ہے اس عہد کے واسطے سے دعا کریں۔

عہد سے مراد اللہ کا حضرت موسی سے کیا ہوا کوئی وعدہ ہے، یا اللہ کا حضرت موسی کے ساتھ معمول مراد ہے؟، یہ بحث مذکورہ غلطی کے علاوہ ہے۔

مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''اور انہوں نے کہا اے ساحر تیرے رب کا تیرے ساتھ جو معمول ہے اس کے واسطے سے ہمارے لیے دعا کر''۔

(۱۵۵)"الکلم الطیب" کا ترجمہ

کلم کلمہ کی جمع ہے، اس لفظ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ جمع ہونے کی وجہ سے مونث تو استعمال ہوتا ہی ہے مذکر بھی استعمال ہوتا ہے۔ (ج: كَلِمٌ بِحَذفِ الهَاءِ، تُذَكَّرُ وتُؤَنَّثُ، يُقال: هُوَ الكَلِمُ، وهِيَ الكَلِمُ۔ (تاج العروس)

اس لغوی وضاحت کی روشنی میں درج ذیل آیت کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ. (فاطر:۱۰)

''تمام تر ستھرے کلمات اسی کی طرف چڑھتے ہیں اور نیک عمل ان کو بلند کرتا ہے''۔(محمد جونا گڑھی)

''اُس کے ہاں جو چیز اوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے، اور عمل صالح اس کو اوپر

چڑھاتا ہے''۔(سید مودودی، اس ترجمہ میں حصر اپنے محل سے ہٹ گیا ہے، قاعدے کی رو سے حصر کا مفہوم مبتدا موخر میں نہیں ہے بلکہ خبر مقدم میں ہے، صحیح ترجمہ یوں ہوگا: ''اسی کے یہاں اوپر چڑھتا ہے پاکیزہ قول'')

''اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام اور جو نیک کام ہے وہ اسے بلند کرتا ہے''۔(احمد رضا خان)

''اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک عمل اس کو بلند کرتے ہیں''۔(فتح محمد جالندھری)

مذکورہ بالا ترجمے لفظ کے مطابق ہیں، البتہ درج ذیل ترجمہ درست نہیں ہے اس میں کلم کا ترجمہ کلمہ یعنی واحد کردیا گیا ہے:

''اس کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عمل صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے''۔(امین احسن اصلاحی)

نوٹ

اللہ کا شکر ہے کہ فلاحی برادران میں قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ پہلے بھی حیاتِ نو کو ان کا سرگرم تعاون حاصل رہا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح اپنے تعاون سے نوازیں گے۔ تمام فلاحی برادران جو اپنے خیالات کو تحریری شکل دینا چاہتے ہیں، حیات نو آپ کی تخلیقات کا منتظر ہے۔ آپ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر ہمیں درج ذیل ای میل پر ارسال کریں۔ ان شاء اللہ آپ کی تحریروں کو شامل اشاعت کیا جائے گا۔[ادارہ]

ای میل: jareedahayatenau@gmail.com

موبائل: 8287025094

واقعہ طوفانِ نوح

جدید سائنس، اسلام اور منطق کی روشنی میں

محمد رضا، ترجمہ: **تنویر آفاقی فلاحی**

جان ایچ والٹن امریکہ کے wheaton college میں 'عہد قدیم' کے استاذ ہیں۔ انھیں کیمبرج یونیورسٹی میں ایک لیکچر پیش کرنے کی دعوت دی گئی، جس کا موضوع تھا آسمانی کتابوں کو نہ سمجھ پانے کا مسئلہ۔ کیوں کہ موصوف خود عیسائی ہیں اس لیے انھوں نے اپنے لیکچر میں تمام کتب سماوی کے بجائے صرف انجیل کے تعلق سے گفتگو کی اور بعض اُن نقاط کی طرف اشارہ کیا جن کو درست طور پر نہیں سمجھا جا سکا ہے، مثلاً کائنات کی تخلیق سات دنوں میں، بابا آدم کی راست تخلیق کا مسئلہ، اور یہ کہ طوفان نوح عالمگیر نہیں تھا، بلکہ زمین کے کسی ایک خطے میں واقع ہوا تھا اور اس طوفان میں زمین کا ایک خطہ غرق ہوا تھا نہ کہ پورا کرۂ ارض اس میں غرق ہوا تھا۔ والٹن نے کہا ہے کہ سائنس ایسے کسی طوفان کے ظہور پذیر ہونے کی تصدیق نہیں کرتی ہے۔ جان ایچ والٹن نے طوفان نوح کے واقعے سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے جو The Lost world of the Flood کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

لیکچر ختم ہونے کے بعد میں جان والٹن کے پاس گیا اور طوفان نوح کے واقعے سے متعلق ان کی رائے کو تفصیل سے جاننا چاہا، کیوں کہ ہم (مسلمان) چھ دنوں میں آسمان وزمین کی تخلیق کے معاملے میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں، حالانکہ کسی نے بھی- سائنسی بنیاد پر- یہ نہیں کہا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی ہے اور یہ چھ دن ۲۴ گھنٹے والے ہی دن تھے۔ بلکہ مسلمانوں میں سے بعض نے تو (اگرچہ ان کی تعداد قلیل ہے) حضرت آدم کی ایک ہی مرحلے میں پیدائش کے مسئلے میں بھی تجاوز سے کام لیا ہے، چنانچہ مسلمانوں میں بھی کچھ لوگ

نظریہ ارتقاء پر ایمان رکھتے ہیں اور انھیں اس نظریے اور اسلام کے درمیان کوئی تعارض نظر نہیں آتا ہے۔ یہ معاملہ دراصل قرآن کو قدیم سے جس طرح سمجھا گیا ہے، اس سے عدم وابستگی کا نتیجہ ہے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، جن میں نمایاں ڈاکٹر عبدالصبور شاہین کی کتاب 'ابی آدم' ہے۔

البتہ ایک مسئلہ جو میرے کانوں کے لیے نیا تھا، وہ یہ تھا کہ نوحؑ کے زمانے میں آنے والا طوفان کوئی عالمی طوفان نہیں تھا اور نہ اس میں پورا کرۂ ارض غرق ہوا تھا۔ جب میں نے اس سلسلے میں والٹن سے سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ علم طبیعیات کے ماہر نہیں ہیں، اُن کا اختصاص تو کتب مقدسہ ہیں۔ پھر انھوں نے میرے اس سوال پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ تم سائنس سے متعلق یہ سوال مجھ سے کر رہے ہو، حالاں کہ ڈاکٹر بوب وہائٹ ہمارے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر بوب وہائٹ کیمبرج یونیورسٹی میں طبیعیات کے پروفیسر ہیں۔ یہ سوال تم ان سے کرو، کیوں کہ وہ اس میدان کے ماہر ہیں۔

میں نے اپنا رخ ڈاکٹر بوب وہائٹ کی جانب پھیر لیا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں، کیوں کہ میں واحد عرب اور مسلمان شخص تھا جو مذہب و سائنس سے متعلق اس پروگرام میں شریک تھا۔ میرے سوال پر ڈاکٹر بوب نے جواب دیا: 'نہیں، مسٹر محمد، اس قسم کے کسی عالمگیر طوفان کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی سائنسی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے ایسے سائنسی اسباب گنوانے لگے جن کی وجہ سے اس قسم کے طوفان کا وقوع پذیر ہونا محال لگتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ تمام سائنسی مطالعے اور تحقیقات اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ طوفان زمین کے کسی محدود و مخصوص علاقے میں آیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا قرآن یہ بات کہتا ہے کہ طوفان نوح ایک عالمگیر طوفان تھا اور کرۂ زمین پر موجود ہر شے اس میں غرق ہو گئی تھی؟ میں نے کہا: ہاں۔ البتہ میں نے قرآن کی کوئی ایک آیت اس سلسلے میں یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن مجھے نہیں مل سکی۔

نوح علیہ السلام کی رسالت عالمی نہیں تھی

بعض مفسرین کی اس رائے کے برعکس کہ حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت دنیا کے تمام

انسانوں کے لیے تھی، کیوں کہ وہ اولوالعزم پیغمبروں میں سے تھے، قرآن کسی شک کی گنجائش چھوڑے بغیر واضح انداز میں یہ بات کہتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ایک مخصوص قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، نہ کہ تمام انسانوں کی طرف۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا فَاخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ (العنکبوت:۱۴)

(اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا، پس وہ ان کے درمیان پچاس کم ایک ہزار سال ٹھہرا، پس اس کی قوم کو طوفان نے آ لیا اس حال میں کہ وہ لوگ ظالم تھے۔)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ فَقَالَ يا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰه (المومنون:۲۳)

(اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ (ہود:۲۵)

(اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف یہ کہہ کر بھیجا کہ میں تمھارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔)

إِنَّا اَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ اَنْ اَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ اَن يا تِيَهُمْ عَذَابٌ اليمٌ. قَالَ يا قَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ (نوح:۱۔۲)

(ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ تو اپنی قوم کو ڈرا قبل اس کے کہ ان پر دردناک عذاب آ جائے۔ اس نے (اپنی قوم سے کہا) اے میری قوم کے لوگو، میں تمھارے لیے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔)

ان آیات میں سے ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جو یہ کہتی ہو کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی رسالت عالمی تھی اور وہ پوری انسانیت کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے کبھی 'اے لوگو' (یا ایھا الناس) کہہ کر مخاطب نہیں کیا بلکہ 'یا قوم' (میری قوم) کہہ کر ہی مخاطب کیا ہے۔ اگر حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت عالمی ہوتی تو وہ 'یا ایھا الناس' کا فقرہ استعمال کرتے، یا اللہ نے اس بات کا ذکر کیا ہوتا کہ اس نے انھیں تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا تھا، جیسا کہ حضرت محمدؐ کے لیے فرمایا ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ سیدنا حضرت محمدؐ کی

رسالت آفاقی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن میں ہمیں یہ آیتیں ملتی ہیں:

وَمَا اَرۡسَلۡنَاکَ إِلّا کَافّةً لِّلنّاسِ بَشِیرًا وَنَذِیرًا (سبا:۲۸)

(اور ہم نے تم کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر۔)

قُلۡ یاایُّهَا النّاسُ إِنّي رَسُولُ اللّٰه إِلَیکُمۡ جَمِیعًا (الاعراف:۱۵۸)

(کہو کہ اے لوگو، میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔)

جہاں تک ان لوگوں کی بات ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت عالمی تھی، کیوں کہ وہ اولوالعزم انبیاء میں سے تھے، تو ان کی یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسی علیہ السلام بھی اولوالعزم انبیاء میں سے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی رسالت عالمی نہیں تھی، بلکہ یہ دونوں انبیاء صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالی حضرت موسی اور ان کے بھائی ہارون علیہما السلام سے کہتا ہے:

فَـاتِیـاهُ فَـقُـولَا إِنّـا رَسُـولَا رَبّکَ فَـاَرۡسِـلۡ مَـعَـنَـا بَنِي إِسۡرَائِیلَ وَلَا تُعَذِّبۡهُمۡ (طہ:۴۷)

(تم دونوں اس (فرعون) کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم تیرے رب کے پیغام بر ہیں، چنانچہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور ان پر عذاب نہ ڈال۔)

اور حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں ہے:

وَیـعَـلِّـمُـهمُ الۡکتَابَ وَالۡحِکمَة وَالتّوۡرَاةَ وَالۡإِنجِیلَ وَرَسُولًا إِلَیٰ بَنِي إِسۡرَائِیلَ (آل عمران ۴۸۔۴۹)

(اور اسے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دیتا ہے، اور رسول بنا کر بھیجا ہے بنی اسرائیل کی طرف۔)

إِذۡ قَـالَ عِیسَـی ابۡـنُ مَـرۡیـمَ یَـا بَـنِي إِسۡرَائِیلَ إِنّي رَسُولُ اللّٰه إِلَیکُم (الصّف ٦)

(اور جب عیسی ابن مریم نے کہا کہ ایک بنی اسرائیل میں تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔)

ان آیات کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ بعض مفسرین کی یہ رائے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اوالوالعزم نبی ہونے کی وجہ سے ان کی رسالت عالمی تھی، درست نہیں ہے۔

صرف قومِ نوح غرق ہوئی تھی

ہمیں قرآن کی آیات کی طرف رجوع کرنے پر کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے (اس طوفان میں) پوری انسانیت کو غرق کر دیا تھا، اس کے برعکس قرآن زور دے کر یہ بات کہتا ہے کہ غرق ہونے والی صرف نوح علیہ السلام کی قوم تھی۔ اس قوم کے وہ لوگ غرق کر دیے گئے تھے، جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی تھی۔

وَاَغْرَقْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا (الاعراف ۶۴)

(اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا۔)

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ (ہود: ۳۷)

(اور کشتی کو ہماری نگرانی اور وحی کی روشنی میں بنا اور مجھ سے ان لوگوں کے سلسلے میں بات نہ کر جنھوں نے ظلم کیا، وہ لوگ غرق ہونے والے ہیں۔)

وَنَصَرْنَاكَ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنَاهُمْ اَجْمَعِينَ (الانبیاء: ۷۷)

(اور ہم نے اس (نوحؑ) کی اس قوم کے مقابلے میں مدد کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، بیشک وہ برے لوگ تھے، سو ہم نے انھیں غرق کر دیا۔)

مِّمَّا خَطِيئَاتِهِمْ اُغْرِقُوا (نوح: ۲۵)

(وہ اپنے گناہوں کے سبب سے غرق کر دیے گئے۔)

ان کے علاوہ بھی متعدد آیات ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ جنھیں غرق کیا گیا وہ صرف حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ تھے، جنھوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلا دیا تھا اور ان کی رسالت کا انکار کر دیا تھا۔

البتہ جو لوگ قرآن کی آیت وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۔ نوح ۲۶۔ (اور نوحؑ نے کہا کہ میرے رب روئے زمین پر کسی کافر کو بسا نہ رہنے

دے۔) سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ طوفان نے پورے روئے زمین کو غرق کر دیا تھا، تو ان کی یہ آیت درحقیقت ان کے کسی بھی کام کی نہیں ہے، نہ فہمِ قرآن کے اعتبار سے اور نہ منطق کے ہی اعتبار سے۔ فہم قرآن کے اعتبار سے اس لیے نہیں کیوں کہ قرآن میں لفظ 'الارض' کا استعمال لازمی طور پر زمین ہی کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بطور مثال آپؐ کے تعلق سے ہمیں اللہ کا یہ ارشاد ملتا ہے:

وَإِن كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا

(الاسراء ۷۶)

(اور وہ تو تجھے اس زمین سے دھکیل دینے کو تھے تاکہ تجھے اس سے نکال دیں)

کسی شخص نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ محمد ﷺ کی قوم آپؐ کو کرہ ارض یا روئے زمین سے ہی نکال دینا چاہتی تھی۔ ان کے درمیان اس بات میں تو اختلاف ہوا ہے کہ 'الارض' سے وہ کون سی جگہ مراد ہے، جہاں سے آپؐ کی قوم آپ کو نکال باہر کرنا چاہتی تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد مکہ ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مدینہ ہے۔ بہرحال لفظ 'الارض' سے جو بھی مراد لیا گیا ہو، آخرکار لفظ 'الارض' کا اطلاق ایک چھوٹی سی بستی ہی پر ہوا ہے، خواہ اس سے مراد مکہ کا شہر ہو یا مدینہ کی بستی ہو۔ ایسا محض اللہ کے رسولؐ کے سلسلے میں ہی نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بھی یہی آیا ہے:

فَأَرَادَ أَن يَسْتَفِزَّهُم مِّنَ الْأَرْضِ فَأَغْرَقْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ جَمِيعًا

(الاسراء:۱۰۳)

(پھر اس نے ارادہ کیا کہ انہیں اس زمین سے نکال دے تب ہم نے اسے اور اس کے سب ساتھیوں کو غرق کر دیا۔)

یہ بات سب جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم مصر میں آباد تھی۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ فرعون نے انھیں 'الارض' (زمین) سے نکال دینے کا ارادہ کیا۔ یعنی 'الارض' کا استعمال اس آیت میں کرۂ زمین کے ایک چھوٹے سے حصے کے لیے ہوا ہے جس کا نام مصر ہے، بلکہ اس سے بالکل متصل والی آیت میں بھی یہ لفظ آیا ہے:

وَقُلْنَا مِن بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ (الاسراء:۱۰۴)
(اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم اس زمین میں آباد رہو پھر جب آخرت کا وعدہ آئے گا ہم تمہیں سمیٹ کر لے آئیں گے۔)

امام قرطبیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں 'الارض' سے مراد 'ارضِ شام' ہے۔ اب آپ میرے ساتھ مل کر قرآن کے اندر کوئی ایک سطر بھی ایسی سوچیے جس میں لفظ 'الارض' کا استعمال دو بار ہوا ہو اور دونوں جگہ اس لفظ کی تفسیر مختلف ہو، یعنی ایک ہی لفظ لیکن اس کی تشریح الگ الگ۔ یہاں تک کہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ سے فرمایا:

اِجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ (یوسف: ۵۵)
(کہا مجھے ملکی خزانوں پر مامور کردو۔)

سب لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ مذکورہ بادشاہ کی حکومت پورے روئے زمین پر نہیں تھی، بلکہ وہ صرف سرزمین مصر کا حکم راں تھا۔ اسی بنیاد پر سورہ نوح کی آیت ۲۶ میں مذکور لفظ 'الارض' سے مراد مکمل روئے زمین نہیں ہے، بلکہ وہ مقام، بستی یا شہر مراد ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی۔

منطقی اعتبار سے یہ بات اس لیے درست نہیں ہے، کیوں کہ اس قسم کے فعل کا صدور ایک عادل وحکیم معبود سے سرزد ہونا ناممکن ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ معبودِ عادل ان قوموں کو ہلاکت میں ڈال دے جن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ بات وہم وخیال میں بھی کیسے آسکتی ہے کہ زمین کے کسی ایک مقام پر کسی مخصوص قوم کی طرف ایک رسول بھیجا جائے، پھر جب اس قوم کے لوگ اس رسول کی رسالت کا انکار کردیں تو بجائے اس کے کہ اللہ تعالی ان مکذبین کو ہلاک کرتا، اس نے یہ چاہا کہ زمین پر موجود تمام لوگوں کو اس کی سزا دے؟ حالاں کہ ان کا کوئی گناہ نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا پیغام ان تک پہنچا ہی نہیں تھا، نہ انھوں نے اُن کی رسالت کا انکار کیا تھا اور نہ وہ اس رسالت کے بارے میں کچھ جانتے ہی تھے۔ مزید یہ کہ اس معبود نے محض اس پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اُن انسانوں کو غرقِ طوفان کردیا جن کا کوئی گناہ نہیں تھا، بلکہ حیوانات و جمادات تک کو تباہ و برباد کردیا؟! دنیا کی ان تمام اشیاء کو کس لیے ہلاک کردیا گیا؟ اس لیے کہ کسی بستی میں آباد کسی قوم نے اپنے رسول کو جھٹلا دیا تھا؟! یہ بات

محال ہے کہ کوئی معبود ایسا کرے جب کہ وہ اپنے بارے میں یہ کہتا ہو:

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنبِهِ (العنکبوت: ۴۰)

(پس ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ پر پکڑا)

اور جو یہ کہتا ہو:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى (فاطر ۱۸)

(اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔)

یعنی ہر شخص کو صرف اس کے قصور اور گناہ کی سزا دی جاتی ہے۔

کشتی میں ہر مخلوق کا جوڑا سوار نہیں کیا گیا تھا

بعض لوگ طوفانِ نوح کے عالمگیر ہونے پر قرآن کے درج ذیل ارشادات کو دلیل بناتے ہیں:

حَتّٰى إِذَا جَاءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَا اٰمَنَ مَعه اِلَّا قَلِيلٌ (ہود: ۴۰)

(یہاں تک کہ جب ہمارا حکم پہنچا اور تنور نے جوش مارا، ہم نے کہا کشتی میں ہر قسم کے جوڑے نر مادہ چڑھا لے اور اپنے گھر والوں کو مگر وہ (نہیں بٹھاؤ) جن کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہے اور سب ایمان والوں کو (بھی بٹھا لو)، اور اس کے ساتھ ایمان تو بہت کم لائے تھے۔)

فَاَوْحَيْنَا إِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَإِذَا جَاءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ فَاسْلُكْ فِيهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ (المومنون: ۲۷)

(پھر ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا، پھر جب ہمارا حکم آ پہنچے اور تنور (زمین سے پانی) ابلنے لگے، پس تو کشتی میں ہر نر مادہ چیز کا جوڑا اور اپنے گھر والوں کو بٹھا لے۔)

مذکورہ دعوے کے سلسلے میں دو باتیں قابلِ غور ہیں:

اول: حیوانات کو کشتی میں لادنے کا حکم طوفان آ جانے سے بالکل متصل محض چند لمحے قبل

دیا گیا تھا:

حَتّٰی إِذَا جَاءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِیهَا (ہود: ۴۰)

(پھر جب ہمارا حکم آ پہنچے اور تنور ابلنے لگے، پس تو کشتی میں ہر نر مادہ چیز کا جوڑا اُس میں بٹھا لے۔)

گویا جانوروں کو لادنے کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب قوم کو غرق کرنے کا حکم آ چکا تھا اور جب کہ تنور سے پانی ابلنے لگا تھا۔ اس وقت حضرت نوحؑ کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ پوری زمین کا چکر لگا کر روئے زمین پر موجود تمام جانوروں کو جمع کر سکتے۔ بلکہ اللہ تعالی نے دوسری آیت میں ایک ایسی تعبیر اختیار فرمائی ہے، جس پر غور کرنا ضروری ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

فَإِذَا جَاءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ فَاسْلُکْ فِیهَا مِن کُلٍّ زَوْجَینِ

(المومنون: ۲۷)

یعنی کبھی اللہ تعالی نے 'احمل' (چڑھا لے، لادلے) کا لفظ استعمال کیا ہے اور کبھی 'اُسلُک' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے راستے میں چلنا اور یہ بات اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جانوروں کو کشتی میں آسانی سے چڑھا لیا تھا اور صرف مانوس (پالتو) جانوروں کو کشتی میں سوار کیا تھا تا کہ طوفان زائل ہو جانے کے بعد ان جانوروں کا دودھ اور گوشت استعمال کر سکیں۔

دوم: حضرت نوح علیہ السلام کے لیے آسانی سے یہ بات کیسے ممکن تھی کہ وہ پوری زمین کا چکر لگا کر زمین پر موجود تمام مخلوقات کے جوڑوں کو جمع کرتے، جب کہ یہ بات معلوم ہے کہ کائنات کے اندر موجود جانداروں کی مختلف انواع کی تعداد تقریباً ۸.۷ ملین ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں اس روئے زمین پر فی الوقت پائے جانے والے جانداروں کا صرف ایک فی صد ہی پایا جاتا تھا، تو اس اعتبار سے یہ تعداد ۸۷۰۰۰ کے برابر ہوتی ہے۔ گویا انھوں نے اس تعداد میں سے ہر قسم کا جوڑا جمع کیا تھا۔ چنانچہ فرض کردہ جانوروں کی تعداد جو کشتی میں سوار کی گئی وہ ۱۷۴۰۰۰ ہوتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ۱۷۴۰۰۰ جان داروں کو ایک ساتھ ایک ابتدائی قسم کی کشتی میں رکھا گیا ہو جو ہزاروں سال پہلے بنائی گئی

تھی؟ (یعنی اس وقت جب کہ اتنی بڑی کشتی بنانا آج کی بہ نسبت ناممکن رہا ہوگا۔) بلکہ وہ تمام جانور ایک ہی کشتی میں ایک ساتھ کیسے رہے ہوں گے؟

سائنس اور کشتیِ نوح

تمام مذاہب کو کشتی نوح کے باقیات سے دلچسپی رہی ہے۔اس سلسلے میں یہاں یوروپ کا حال بھی عالم عرب سے کوئی اچھا نہیں ہے۔البتہ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو کشتی دریافت کرنے میں دلچسپی اس لیے رہی ہے کیوں کہ ان کا گمان ہے کہ اللہ تعالی نے اس کشتی کو ابھی تک باقی رکھا ہوا ہے۔کیوں کہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا فَاَخَذَهُمُ الطُّوفَانُ وَهُمْ ظَالِمُونَ . فَاَنجَيْنَاهُ وَاَصْحَابَ السَّفِينَةِ وَجَعَلْنَاهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (العنکبوت:۱۴۔۱۵)

اور ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، پھر وہ ان میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔پھر انھیں طوفان نے آ پکڑا اور وہ ظالم تھے۔پھر ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور ہم نے کشتی والوں کو جہان والوں کے لیے نشانی بنا دیا۔

مسلمانوں کا ماننا ہے کہ اللہ تعالی نے کشتی نوح کو اب تک اس لیے باقی رکھا ہے تا کہ اسے ہمارے لیے ایک نشانی بنا دے۔حالانکہ درست رائے یہ ہے کہ کشتی نشانی نہیں ہے، بلکہ یہ واقعہ اور اس سے حاصل ہونے والی عبرت ہمارے لیے نشانی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کشتی کے موجود ہونے یا نہ ہونے سے ہم پر کیا فرق پڑتا ہے؟ اس رائے کی تائید اللہ تعالی کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:

إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنَاهُمْ فِي الْجَارِيَةِ. لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (الحاقہ:۱۲)

(بے شک جب پانی حد سے گزر گیا تھا تو ہم نے تمھیں کشتی میں سوار کر لیا تا کہ ہم اسے تمہارے لیے ایک یادگار بنائیں اور اس کو یاد رکھنے والے کان یاد رکھیں۔)

یعنی وہ نصیحت جس کے بارے میں اللہ یہ چاہتا ہے کہ کان اور عقل اسے یاد رکھیں وہ طوفان نوح کا قصہ اور اس سے حاصل ہونے والی نصیحت ہے، ورنہ اس کا کوئی معنی ومفہوم نہیں کہ عقلیں کشتی کو یاد رکھیں۔ اس بات کی تائید اللہ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:

وَ آيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ (یٰس:۴۱)

(اور ان کے لیے یہ بھی نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری کشتی میں سوار کیا۔)

یعنی آیت اور نشانی وہ عبرت ونصیحت ہے جو اس قصے کو بیان کرنے سے برآمد ہوتی ہے نہ کہ نفسِ کشتیِ نوح۔

آخر میں، میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ اِس وقت تک بھی کشتیِ نوح کے موجود ہونے کے سلسلے میں کوئی سائنسی دلیل موجود نہیں ہے، اگر چہ کشتی کے انکشاف کے سلسلے میں بعض دعوے ہم سنتے رہتے ہیں۔ کشتی کی دریافت کا دعوی کرنے والے کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے ترکی میں جبل ارارات پر کشتی کے اجزا دریافت کیے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جس کا ذکر کتاب مقدس میں اس طرح آیا ہے کہ اسی مقام پر کشتی جا کر ٹھہر گئی تھی۔ یہ دریافت وائلیٹ ایم کمنگس Violet M. Cummings کی ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے Noah's Ark: Fable or fact کے عنوان سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ایران کے اندر البرز پہاڑی کا جو سلسلہ ہے، وہاں اس کشتی کو دریافت کیا گیا ہے، اور آخر کار علوم ارضیات اور علومِ آثار کے ماہرین نے اس قسم کی تمام تحقیقات کو جھوٹ اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

سائنس اور طوفان

اگر سائنسی اعتبار سے ہم اس طرح کے (عالمگیر) طوفان کو فرض بھی کر لیں تو آسمان اپنا تمام تر پانی برسا دے (جو کہ تقریباً ۱۳۰۰۰ کم۳ کے برابر ہوتا ہے)، اور زمین اپنا سارا پانی باہر نکال دے تو ہاں سائنسی اعتبار سے یہ ممکن ہے کہ ایسا کوئی طوفان آجائے جو پورے کرۂ ارض کو غرقاب کر دے۔ ایسی صورت میں پوری زمین غرق ہو جائے گی اور پانی کی بلندی ۲.۵ سینٹی میٹر ہوگی، یعنی عالم بشریت ایک بالشت پانی میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ اور اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ ایک

بالشت کی لمبائی ۸ سے ۱۵ سینٹی میٹر کے بقدر ہوتی ہے تو ایسی صورت میں لوگ ایک تہائی بالشت پانی میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

طوفان کی صورت حال کو جس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ پانی پہاڑ کی چوٹیوں تک بلند ہو گیا تھا، اور پوری زمین پانی میں ڈوب چکی تھی، اگر اس صورت حال کو ہم سائنسی طور پر فرض بھی کریں تو اس کے لیے پانی کا حجم تقریباً ۴۵۰۰۰۰۰۰۰۰ کم۳ چاہیے، یعنی آج سمندروں میں پانی کی جو جملہ مقدار ہے اس کا تقریباً ۳.۲۵ گنا زیادہ پانی مطلوب ہوگا۔ حالاں کہ ہوائی غلاف محض ۱۳۰۰۰ کم۳ پر مشتمل ہے۔ سوال یہ ہے کہ (عالمگیر نوعیت کا طوفان برپا کرنے کے لیے) یہ زائد پانی کہاں سے آیا ہوگا اور طوفان ٹل جانے کے بعد یہ پانی کہاں چلا گیا؟ اگر ہم یہ مان لیں کہ یہ پانی آج بھی زمین کے اندر موجود ہے، تو اس کے لیے ایک ایسے مکعب کی ضرورت ہوگی جس کی لمبائی ہر جانب سے ۱۶۵۰ کلومیٹر ہو اور زمین کے اندر ابھی تک بھی اس طرح کا کوئی ذخیرہ دکھائی نہیں دیا ہے۔

البتہ ایک سائنسی تحقیق موجود ہے جسے کولمبیا یونیورسٹی کے دو سائنس دانوں نے انجام دیا ہے۔ ان دونوں کے نام ولیم بی ایف ریان William B.F. Ryan اور ڈاکٹر والٹر سی پٹ مین Walter C. Pitman ہیں۔ اس تحقیق میں انھوں نے یہ مفروضہ پیش کیا ہے کہ تقریباً ۷۰۰۰ برس پہلے بحر اسود کے علاقے میں پانی تباہ کن حد تک بلند ہو گیا تھا۔ اس وقوعے کو سائنس کی زبان میں 'بحر اسود میں طوفان کا مفروضہ(Black Sea Deluge Hypothesis) کہا جاتا ہے۔ اسی مفروضے پر ایک قدرے مفصل کتاب The New Scientific Discoveries About the :Noah's Flood Event That Changed History کے نام سے بھی لکھی گئی ہے۔

اگر اس مفروضے کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ اسی رجحان کی تائید کرتا ہے جسے ہم نے پیش کیا ہے، یعنی یہ کہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں آنے والا طوفان ایک علاقائی طوفان تھا نہ کہ عالمی۔

طلاقِ ثلاثہ

ایک علمی و تحقیقی بحث (قسط دوم)

امت کے علماء وفقہاء کے غور وفکر کے لیے

طلاقِ ثلاثہ کے موضوع پر محوری آیت

آیاتِ طلاق کا ضروری حد تک، موضوعی مطالعہ کر لینے کے بعد، آیئے اس آیت کا مطالعہ کریں، جو زیرِ بحث مسئلہ میں بنیادی اور خاص آیت ہے۔ وہ آیت ہے، آیتِ مرتان۔ پوری آیت تین اجزاء میں اس طرح ہے:

الف)الطَّلاَقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاکٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ (البقرۃ: ۲۲۸)

ب) وَلاَ يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَأْخُذُواْ مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئاً إِلاَّ أَن يَخَافَا أَلاَّ يُقِيمَا حُدُودَ اللّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلاَّ يُقِيمَا حُدُودَ اللّهِ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللّهِ فَلاَ تَعْتَدُوهَا وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّهِ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۲۲۸)

ت)فَإِن طَلَّقَهَا فَلاَ تَحِلُّ لَهُ مِن بَعْدُ حَتَّىَ تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ...(۲۲۹)

ترجمہ: طلاق دینا دو بار ہے۔ (طلاق دینے کی دو باریاں ہیں۔ طلاق دینے کے لیے دو باریاں ہیں۔ طلاق دینا، دو باریوں میں ہے)۔ پھر امساک ہے یا تسریح ہے۔ پھر اگر وہ اس کو طلاق دے (تیسری بار)، تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں رہے گی۔

آیت کی پانچ تفسیریں:

تفسیری ذخیرہ میں، اس آیت کی پانچ تفسیریں پائی جاتی ہیں:

(۱) **تفسیرِ اول**: طلاق دو بار ہے۔ پس (طلاق کی ہر باری کے بعد) یا تو ایک امساک ہے یا ایک تسریح۔ پھر اگر (تیسری بار) طلاق دے تو بیوی حلال نہیں رہے گی۔ اس تفسیر کا اختصار، یہ ہے: (طلاق - امساک یا تسریح) - (طلاق - امساک یا تسریح) - طلاق (تحریم)۔ یعنی طلاق دے پھر امساک یا تسریح کرے۔ دوسری طلاق دے پھر امساک یا تسریح کرے۔ تیسری طلاق کے بعد عورت حلال نہیں رہے گی۔

وضاحت: یہ دو الگ الگ طلاقیں ہیں، جن میں سے ہر طلاق کے بعد امساک یا تسریح ہے۔ تسریح کی صورت میں دوسری یا تیسری ہر طلاق سے پہلے، نکاح جدید ہے۔ اس تأویل میں امساک او تسریح کا عطف، دونوں بار کی ہر طلاق پر الگ الگ ہے۔ یعنی 'الطلاق مرۃٌ فامساک او تسریح'، اور 'الطلاق مرۃٌ ثانیۃٌ فامساک او تسریح'، دونوں کو ایک ہی جملے میں یک جا کر کے مختصر کر دیا گیا ہے۔ یعنی **الطلاق مرتان، فامساک او تسریح**۔

اصل میں یہاں 'الطلاق مرۃٌ و مرۃٌ' کو 'الطلاق مرّتان' کر دیا گیا۔ نحوی قاعدہ یہی ہے کہ مرّۃٌ اور مرّۃٌ، دو مفرد مرّۃٌ کو صیغۂ مثنّٰی، مرّتان میں بدل دیا جائے، اور ضرورت ہو تو الگ الگ کر دیا جائے۔ 'فامساک او تسریح' اور 'فامساک او تسریح' کی دو عبارتوں کو یکجا 'فامساک او تسریح' کر دیا گیا۔ ایک 'فامساک او تسریح' کو حذف کر دیا گیا۔ یہ حذف، علم المعانی کے اسلوب، ایجازِ حذف کے مطابق ہے۔ ایجازِ حذف کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسا قرینہ ہو، جو محذوف کو معیّن کرتا ہو۔ یہاں، اس حذف کا قرینہ، آیت کا عبارۃ النص اور ما سیق لاجلہ الکلام ہے۔ یعنی شوہر کو، طلاق کے معاملہ میں، دو بار امساک کا موقع دینا، اور تیسری طلاق کے بعد یہ موقع نہ دینا۔ اس طرح 'الطلاق مرۃٌ فامساک او تسریح' اور 'الطلاق مرۃٌ ثانیۃٌ فامساک او تسریح'، دونوں مل کر 'الطلاق مرتان، فامساک او تسریح' بن گیا۔ ایجاز کئی شکلوں میں ہوسکتا ہے۔ بطورِ تذکرہ، ایجاز کی ایک مثال 'یسئلونک عن الاھلۃ، قل ھی مواقیت' میں ہے۔ 'ھی مواقیت' دراصل، بارہ بار 'الھلال میقات' کا اختصار ہے۔ مبتدا اور خبر دونوں کو جمع کے صیغہ میں کر کے، بارہ جملوں کو، ایک جملہ بنا دیا گیا ہے۔

اس تأ ویل میں امساک اوتسریح کا خیار ہر طلاق کے بعد ہے۔ اس طرح اس میں دو بار امساک یا تسریح و نکاحِ جدید کا خیار ہے۔ یہ تأ ویل، نہ صرف آیت کے مقصود کے مطابق ہے جو کہ کلام کے سیاق اور آیت کے سبب و شأنِ نزول سے معلوم و متعین ہے، بلکہ یہ خود قرآن کی اپنی تفسیر ہے۔ اسی لیے یہ تأ ویل صحیح ہے۔ اس تأ ویل کی صحّت پر پوری امت کے فقہاء کا اتفاق ہے، سوائے چند کے۔ محققین فقہاء و مفسرین کے نزدیک صرف یہی تفسیر صحیح ہے، باقی تفسیریں خطأ ہیں۔

(۲) **تفسیرِ ثانی**: طلاق دو بار ہے۔ پھر (دونوں طلاق یکے بعد دیگرے دینے کے بعد) یا تو ایک امساک ہے یا ایک تسریح۔ پھر اگر (تیسری بار) طلاق دے تو بیوی حلال نہیں رہے گی۔ اس تفسیر کا اختصار، یہ ہے: (طلاق - طلاق) - امساک یا تسریح - طلاق - تحریم یعنی دو طلاقیں یکے بعد دیگرے دیں۔ پھر امساک یا تسریح کیا۔ پھر تیسری طلاق دی۔

وضاحت: اس تفسیر میں 'امساک اوتسریح' کا عطف، دو بار کی طلاقوں کے مجموعہ پر ہے۔ یعنی دو طلاقیں یکے بعد دیگرے دینے کے بعد ہی صرف ایک بار امساک یا تسریح کا خیار ہے۔ محض ایک بار طلاق دے کر امساک یا تسریح نہیں ہوسکتی۔ امساک یا تسریح، دو طلاقیں یکے بعد دیگرے دینے کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔

گنتی کے چند مفسرین اور فقہاء کے نزدیک صرف یہی تفسیر صحیح ہے۔ لیکن یہ ایک ظاہری تفسیر ہے اور آیت کے مقصود اور عبارۃ النص کے خلاف ہے۔ پورے قرآن میں، ایک طلاق دینے کے بعد، دوسری طلاق دینے کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔

یکے بعد دیگرے دو طلاق والی اس تفسیر پر بارہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱۔ اصولِ تفسیر کے قاعدہ: '**القرآنُ یفسّرُ بعضُه بعضًا**' کے خلاف: '**الطلاق مرتان فامساک او تسریح**' کی تفسیر خود قرآن نے اگلی آیت میں کردی ہے۔ **وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاء فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوف** (البقرۃ:۲۳۱) [اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو پھر وہ اپنی مقررہ مدت (عدت) کو پہنچ جائیں تو۔ دستور کے مطابق یا تو انھیں روک لو یا دستور کے مطابق ان کو آزاد کردو۔] یہی بات دوسرے مقام پر کہی ہے: **فَإِذَا**

بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ (الطلاق:۲)۔قرآن کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائی دوطلاقوں میں سے کسی بھی طلاق کے بعد،عدت کے دوران یا تو امساک ہے یا اس کے خاتمے پر تسریح۔امساک یا تسریح کے ان دومواقع کو کسی بھی عمل کے ذریعہ خواہ وہ طلاق ہو،ختم یا تنگ نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا جب قرآن خود اپنی تفسیر کردے تو کسی اور تفسیر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔فنِّ تفسیر کا مشہور قاعدہ ہے:القرآنُ يُفَسّرُ بعضُه بعضاً (قرآن کا ایک حصہ، دوسرے حصے کی باہم تفسیر کرتا ہے)۔

۲۔عبارۃ النص اور مقصودِ کلام کے خلاف: یہ تفسیر، آیت کے عبارۃ النص کے خلاف ہے۔آیت کا مقصود، امساک ونکاح کی گنتی کی تحدید ہے۔یعنی یہ کہ شوہر کو صرف تین بار طلاق دینے کا اختیار ہے۔ان میں سے تیسری بار طلاق دینے کے بعد، امساک یا نکاح کا کوئی اختیار نہیں ہے۔جب کہ تیسری طلاق سے پہلے پہلے، ہر طلاق کے بعد،یعنی دو بار امساک یا نکاح کا اختیار حاصل ہے۔یہ معنیٰ آیت کا عبارۃ النص ہے۔اگر پہلی طلاق کے بعد، دوسری طلاق سے پہلے، امساک یا نکاح کا فصل نہ ہو، بلکہ یکے بعد دیگرے، بلا فصل دو طلاقیں ہوں، تو امساک یا تسریح کا خیار ایک ہی بار رہ جائے گا، اور یہ معنیٰ یعنی امساک یا نکاح کو ایک بار تک محدود کرنا، آیت کے عبارۃ النص کے خلاف ہے۔

یہ بات کہ یہی عبارۃ النص ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ لفظِ 'طلاق' پر لامِ عہد ہے، اور اس کا معہود وہ طلاق ہے جس کا ذکر پچھلی آیت (وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْن ...وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِن (البقرۃ:۲۲۷) میں ہوا،یعنی وہ طلاق جس کے بعد شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رجوع کرلے یعنی طلاق رجعی۔

۳۔مفہوم المخالفۃ کے خلاف: یہ تفسیر، آیت کے مفہوم المخالفہ کے خلاف ہے۔آیت تیسری طلاق کے بعد، امساک اور نکاح پر روک لگاتی ہے۔اس سے پہلے کی کسی طلاق کے بعد یعنی پہلی اور دوسری طلاق کے بعد یہ روک نہیں ہے۔بلکہ ہر طلاق کے بعد، امساک یا نکاح کا خیار دیتی ہے۔یہ معنیٰ آیت کا مفہومِ مخالف ہے، اور معتبر ہے، کیوں کہ آیت کے عبارۃ النص کا تقاضا ہے۔اس طرح یکے بعد دیگرے دو طلاقیں، امساک یا نکاح کے فصل کے بغیر

دینا، آیت کے مفہوم مخالف کے خلاف ہے۔

۴۔ معقول و منطق کے خلاف: ایک طلاق یافتہ کو دوبارہ طلاق دینا، تحصیلِ حاصل اور معقول و منطق کے خلاف ہے۔ جب ایک بار کی طلاق، اپنے معنیٰ و مقصد اور اثر میں مکمل اور کافی ہے، تو اسی طلاق کی حالت میں دوسری بار کی طلاق، بے معنیٰ، بے فائدہ، لایعنی اور لغو ہے۔ اس طرح، یہ طلاق کی بے جا تکرار ہے۔ یا تو پہلی طلاق بے اثر ہے، یا دوسری۔ اگر پہلی بے اثر ہے، تو اسے بے اثر کرنے والی چیز کیا ہے؟ اگر دوسری بے اثر ہے، تو بے اثر طلاق کا فائدہ کیا ہے؟ اگر دونوں مؤثر ہیں، تو پہلی اور دوسری طلاق کا باہمی تعلق کیا ہے؟ پہلی طلاق سے مطلوب اگر تسریح ہے، جو کہ عدت کے خاتمہ پر خود بہ خود حاصل ہے، تو دوسری طلاق کا حاصل کیا ہے؟ اس سے مزید کیا مطلوب ہے؟ اسی لیے یہ از قبیل تحصیلِ حاصل ہے، اور غیر معقول ہے۔ اگر محض تین کی گنتی پوری کرنے کے لیے 'دوسری طلاق دینا' ایک ضرورت ہے، تو یہ اس لیے معقول نہیں ہے کہ ابھی طلاق کی محض تین کی گنتی سے 'تحریمِ زوجہ کے حکم کا ناشئ ہونا' ثابت نہیں ہے۔ یہی تو زیرِ بحث ہے۔

۵۔ قاعدۂ محلیت و اہلیت کے خلاف: طلاق از احکامِ نکاح ہے، اور اس کا محل، عقدِ نکاح اور منکوحہ ہے۔ یَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ (احزاب: ۴۹) [اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر انھیں طلاق دو] یعنی طلاق نکاح کے بعد ہے، یا اس کے بعد جو نکاح کا قائم مقام ہو، جیسے امساک۔ پہلے سے طلاق شدہ، پھر سے دوسری طلاق کی محل نہیں ہے۔ دوبارہ طلاق، بے محل طلاق ہے۔ اسی لیے بے اثر اور بے ثمر ہوگی۔ اس طرح یہ تفسیر قاعدۂ محلیت کے خلاف ہے۔ اسی طرح شوہر ایک طلاق دینے کے بعد، دوسری طلاق کا اہل نہیں ہے، جب تک مطلقہ کو، امساک یا نکاح کے ذریعہ، پھر سے عقدِ زوجیت میں نہ لے آئے۔

۶۔ قاعدۂ عرف و عادت کے خلاف: نزولِ قرآن اور تشریعِ طلاق کے وقت، سماجی عرف و عادت، ایک طلاق دے کر امساک کرنے کا تھا۔ دو طلاقیں دے کر امساک کرنے کا نہیں تھا۔ آیت نے اس عرف و عادت کو برقرار رکھا۔ اس لیے دو طلاقیں یکے بعد دیگرے

دے کر امساک کرنا، اس عرف کے خلاف ہے جو کہ شرعاً معتبر ہے۔ آیت نے صرف، طلاق وامساک کے عمل کو دو سے زائد بار دہرانے پر پابندی لگائی، جو کہ ان کے عرف میں غیر محدود طور پر رائج تھا۔

۷۔ قاعدۂ ضرورت کے خلاف: طلاق دینا ایک ضرورت اور مجبوری ہے۔ جو چیز مجبوری اور ضرورت ہو، وہ بقدرِ مجبوری وضرورت ہوتی ہے۔ اگر پہلی طلاق سے عقدِ نکاح منقطع ہوجاتا ہے، تو دوسری طلاق زائد از ضرورت ہے۔ اس طرح یہ تفسیر، قاعدۂ ضرورت کے خلاف ہے۔ مشہور قاعدہ ہے: **الضرورات تقدر بقدرها۔**

۸۔ بابِ عقود میں جاری قاعدہ کے خلاف: تمام عقود ومعاملات میں قبول وایجاب، نیز فسخ وقطع کے لیے، مقررہ صیغوں کی ادائیگی، ایک بار کرنا، کافی ہے۔ طلاق، عقدِ نکاح کو قطع کرنے کے لیے ہے، اور بابِ عقود میں سے ہے۔ لہذا عقدِ نکاح کے فسخ کے لیے دو بار طلاق، خلافِ قاعدہ ہے۔ طلاق دینا کوئی کارِثواب نہیں ہے کہ بار بار کرنے کا استحباب ہو۔

۹۔ تیسیر وترخیص کی مصلحت کے خلاف: دوبار کی طلاقوں میں، ہر بار کی طلاق کے بعد امساک کی سہولت دی گئی اور اس طرح دو بار امساک کا موقع دیا گیا۔ مصلحت بتائی گئی کہ انسان کو دو بار ازدواجی رشتہ کو بچانے کا موقع ملے۔ یکے بعد دیگرے دو بار طلاقیں دے کر، صرف ایک بار امساک کا موقع دینا، تحفظِ رشتہ کے مواقع کو کم کرنا ہے۔ سہولت اور رخصت کو کم کرنا، شریعتِ سمحہ کے تیسیری مزاج کے خلاف ہے۔

۱۰۔ عدت کے لحاظ واحصاء کے قرآنی ضابطے کے خلاف: ہر طلاق کے بعد اس کی اپنی مستقل عدت ہے۔ اس میں استثناء صرف طلاقِ غیر ممسوسہ (غیر مدخولہ) کا ہے، جس کے لیے نہ تو عدت ہے اور نہ امساک کا خیار (الاحزاب ۴۹)۔ ہر طلاق کے لیے عدت کا لحاظ اور احصاء واحاطہ فرض کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہر طلاق کی پوری عدت گزاری جائے گی۔ ایک طلاق کی جاری عدت میں دوسری طلاق دینے سے نہ پہلی طلاق کا احصاء ممکن ہے اور نہ دوسری طلاق کا۔ دوسری طلاق کی اپنی عدت نہ ہونے کی وجہ سے، یہ پہلی طلاق کا محض ضمیمہ بن جاتی ہے اور ناقص رہتی ہے۔

۱۱۔عدت وامساک کے قرآنی ضابطے کے خلاف: قرآن نے آیت: وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوف (البقرۃ:۲۳۱)اور آیت: فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ (الطلاق:۲) کے ذریعہ عدت اور امساک وتسریح کا ایک واضح ضابطہ مقرر کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کسی بھی طلاق کے متصلاً بعد، عدت کے دوران یا تو امساک ہوسکتا ہے یا اس کے خاتمے پر تسریح۔ کوئی دوسرا عمل جائز نہیں ہے۔ چناں چہ ان دونوں آیتوں میں سے کوئی بھی، ایک طلاق کی جاری عدت کے اندر، طلاق پر طلاق یعنی دوسری طلاق کے تصور کو قبول نہیں کرتی۔ لہٰذا یہ تفسیر، طلاق و عدت اور امساک وتسریح کے قرآنی ضابطوں کے خلاف ہے۔

۱۲۔لفظِ طلاق کے قرآنی استعمال کے خلاف: قرآنِ مجید میں طلاق کے احکام جہاں بھی آئے ہیں، وہاں طلاق سے مراد مطلق طلاق ہے یعنی عدد سے مجرد، بس ایک بار طلاق دینا۔ نیز اس سے مراد یا تو طلاقِ امساکی ہے یا طلاق تسریحی، نہ کہ مسلسل اور بلا فصل، یکے بعد دیگرے دو طلاقیں دینا۔ لہٰذا یہ معنیٰ، طلاق کے قرآنی استعمال کے خلاف ہے۔ قرآن میں مندرجہ ذیل بارہ مقامات پر، فعل طلاق کا استعمال ملاحظہ کریں۔ پورے قرآن میں، ایک طلاق دینے کے بعد، لگاتار دوسری طلاق دینے کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے:

۱) لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِم ... وَإِنْ عَزَمُواْ الطَّلاَقَ فَإِنَّ اللّهَ سَمِيعٌ عَلِيم (البقرۃ: ۲۲۷)إِنْ عَزَمُواْ الطَّلاَقَ میں ظاہر ہے کہ مطلق طلاق مراد ہے، نہ کہ دو طلاق۔

۲)وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلاَثَةَ قُرُوَءٍ (البقرۃ:۲۲۸)۔ مطلقات سے مراد، ایک ہی طلاق والی مطلقہ ہے خواہ امساکی ہو یا تسریحی، نہ کہ دو مسلسل طلاقوں والی۔

۳)الطَّلاَقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوف (البقرۃ:۲۲۸) دونوں بار کی طلاقیں قابلِ رجعت ہیں۔ مطلق عن العدد طلاق مراد ہے۔ بلکہ لازمی طور پر ایک ہی بار کی طلاق مراد ہے۔

۴)فَإِن طَلَّقَهَافَلاَ تَحِلُّ لَه (البقرۃ:۲۲۸)۔ فان طلقھا سے مراد محض طلاق ہی ہے، نہ کہ دو طلاق۔ اگر دو طلاق مراد لیں، تو کل طلاقیں چار ہو جائیں گی۔

یعنی دو بار کی طلاقوں کے بعد تیسری بار کی طلاق ہی وہ طلاق ہے جو قابل رجعت نہیں

ہے۔ یہ تنہا موقع ہے جب طلاق سے مراد طلاق غلیظہ ہے، کیوں کہ یہ تیسری بار کی طلاق ہے۔ اس کے باوجود طلاق عدد سے مجرد ہے۔ کیوں کہ دو بار طلاق کی تعبیر، امساک وتسریح کے خیار کی نسبت سے اختیار کی گئی ہے، نہ کہ محض طلاق کی تکرار کے اعتبار سے۔

۵) وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النَّسَاء فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوف (البقرۃ: ۲۳۱)۔ یہاں عدت کے اندر، بلوغِ اجل سے پہلے یا تو امساک ہے، یا بلوغِ اجل کے بعد تسریح ہے۔ دوسری طلاق دینے جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ یعنی مراد قابل امساک وتسریح طلاق ہے، عدد کی قید سے مجرد۔

۶) وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاء فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلاَ تَعْضُلُوهُن (البقرۃ:۲۳۲)۔ یہاں مراد ایک ہی طلاق کے بعد بلوغِ اجل (اور تسریح ہو جانے پر) دوبارہ نکاح سے روکنے کی ممانعت آئی۔ دو طلاق کے بعد بلوغِ اجل کا کوئی معنیٰ نہیں ہے۔ گویا مراد قابل امساک وتسریح طلاق ہے، مطلق عن العدد۔

۷) لاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاء مَا لَمْ تَمَسُّوهُنُّ أَوْ تَفْرِضُواْ لَهُنَّ فَرِيضَة (البقرۃ:۲۳۶)۔ یہاں طلاق سے مراد ایک ہی طلاق ہے، نہ کہ یکے بعد دیگرے دو طلاقیں۔

۸) وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَة (البقرۃ: ۲۳۷)۔ یہاں طلاق سے مراد ایک ہی طلاق ہے، نہ کہ دو طلاقیں۔

۹) وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقّاً عَلَى الْمُتَّقِين (البقرۃ:۲۴۱)۔ مراد ایک ہی طلاق والی مطلقہ ہے۔ دو یا تین مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

۱۰) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاء فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّة (الطلاق: ۱)۔ مراد مطلق طلاق ہے، یعنی ایک بار طلاق دینا۔ دو بار طلاق دینا، مراد نہیں ہے۔ .... لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِن .... (طلاق:۱) فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُن ... (طلاق:۲) مراد وہ طلاق ہے جو قابلِ امساک ہے، اور مجرد عن العدد ہے۔

۱۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ ... فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحاً جَمِيلاً (الاحزاب:۴۹)۔ مراد

غیر مدخولہ مسرّحہ ہے۔ طلاق دینے سے مراد ایک ہی بار طلاق دینا ہے۔ جدید نکاح کرسکتی ہے۔ طلاق سے مراد تیسری طلاق نہیں ہوسکتی۔

۱۲) عَسَی رَبُّهُ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبْدِلَهُ أَزْوَاجاً خَيْراً مِّنكُنَّ مُسْلِمَات ...(التحریم: ۵)۔ مراد ایک ہی طلاق ہے۔ ابدالِ زوج، اسی ایک طلاق کے بعد ہوسکتا ہے، دوبار طلاق کی ضرورت نہیں۔

مذکورہ بالا تمام مقامات پر، کہیں بھی کوئی قرینہ موجود نہیں ہے جو یکے بعد دیگرے دو طلاقوں یا ایک سے زائد طلاق پر دلالت کرے۔ معلوم ہوا کہ طلاق کی اصل ایک طلاق ہے یعنی پہلی طلاق۔ اسی کے بعد امساک یا تسریح کے احکام لاگو ہوں گے۔

پہلی اور دوسری تفسیر کا مجموعہ: (تفسیرِ جمہور)

جمہور فقہاء و مفسرین، پہلی اور دوسری دونوں تفسیروں کو صحیح مانتے ہیں اور دونوں معنیٰ کو جمع کرنے کے قائل ہیں۔ پہلی کو طلاقِ احسن، اور دوسری کو ایک صحیح اور جائز خیار کے طور پر، طلاقِ حسن کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں تفسیروں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر تین اصولی اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱۔ حقیقت و مجاز کو بہ یک وقت مراد نہ لینے کے قاعدے کے خلاف: پہلی اور دوسری تفسیر کو جمع کرنا، قاعدے کے خلاف ہے۔ پہلے، طلاق کا یکے بعد دیگرے دو بار ہونا، اور دو بار سے پہلے، امساک کا خیار نہ ملنا، عبارت 'الطلاق مرتان فامساک' کا جس طرح معنیٰ ظاہر ہے، اسی طرح معنیٰ حقیقی ہے۔ مگر متعدد قرائن ہیں، جو حقیقی معنیٰ لینے میں مانع ہیں، جن کا ذکر اب تک اعتراضات کی شکل میں کیا گیا۔ جب کہ دونوں طلاقوں میں سے ہر طلاق کے بعد امساک کا ہونا، عبارت کا معنیٰ مجازی ہے، اور علم البلاغۃ میں معانی کے ایک اسلوب 'ایجاز' پر مبنی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ حقیقی اور مجازی معنیٰ بہ یک وقت مراد نہیں لے سکتے۔ اس لیے دونوں تفسیروں کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے آیتِ ملامسۃ: (أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاء، المائدۃ: ۶) میں ملامسۃ سے مراد جماع لیا گیا ہے، تو اس کے ساتھ ہاتھ سے چھونا مراد نہیں لیا جا سکتا۔

۲۔ظاہر ونص میں تعارض کے وقت قاعدۂ ترجیح کے خلاف :**الطلاق مرتان، فامساک**، یکے بعد دیگرے دوطلاقیں دے کر امساک کرنے کے معنیٰ میں 'ظاہر' ہے۔ جب کہ آیت اپنے کُل میں، امسا کی طلاقوں کی تعداد، تین سے کم، مگر ساتھ ہی ایک سے زیادہ یعنی دو بار معین کرنے میں 'نص' کا درجہ رکھتی ہے۔ یاد رکھیں کہ ظاہری معنیٰ یعنی دو طلاقیں، بلافصلِ امساک وتسریح، یکے بعد دیگرے مراد لینے میں امساک یا تسریح کا موقع صرف ایک بار رہ جاتا ہے اور یہ مقصودِ کلام کے خلاف ہے۔اس طرح، جب ظاہر ونصّ متعارض ہیں اور دونوں پر عمل نہیں کیا جا سکتا تو نص کو ظاہر پر ترجیح دینا واجب ہے۔ دونوں معنیٰ جمع نہیں ہو سکتے۔

کسی نصِّ شرعی سے، شارع کی مراد، محض لغوی امکان سے طے نہیں ہوتی۔ **الطلاق مرتان**، کی تعبیر میں اگرچہ بہ ظاہر معنیٰ، طلاق کے دو بار ہونے کا ہے مگر یہ صرف ایک معنیٰ یعنی مرۃ کے معنیٰ کو پورا کرتا ہے۔ ہر دو طلاق کے درمیان، امساک یا تسریح کی قید کے معنیٰ کو پورا نہیں کرتا، جو کہ فامساک اوتسریح کے فقرہ کا حاصل ہے۔اس قید کے ساتھ مرۃ کا معنیٰ، دو بار اسی وقت پورا ہوگا، جب پہلی طلاق کے بعد بھی امساک یا تسریح حائل ہو۔

۳۔مفسَّر کی موجودگی میں کسی اور معنیٰ پر عمل کرنا خلافِ اصول: مفسَّر وہ ہے جس کی لفظی مراد خود متکلم کی جانب سے بیان کے ذریعہ، اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ کسی تأویل یا تخصیص کا احتمال نہیں رہتا۔اسی لیے اس کا اصولی حکم یہ ہے کہ اس پر لازمًا اور لامحالہ عمل کیا جائے۔ تعارض کے وقت، اس کو 'نص' پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ لفظِ مشترک کے کئی معانی میں سے کوئی معنیٰ اگر متکلم کے بیان سے ترجیح پا جائے تو وہ مفسر قرار پاتا ہے اور اس پر یقینی طور پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور تعارض کے وقت، اس کو، غالبِ رائے سے ترجیح پانے والے 'مؤوّل' پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ یہاں آیتِ مرتان میں تفسیرِ اول یعنی ہر طلاق کے بعد امساک یا تسریح کا موقع ملنا، قرآن ہی کی (دو) آیتوں کے ذریعہ معنیٰ مفسّر ہے۔لہٰذا اسے دوسرے ہر معنیٰ پر ترجیح حاصل ہوگی۔ دونوں معنیٰ کو بہ یک وقت مراد نہیں لیا جا سکتا۔

(۳)تفسیرِ ثالث:

اس تفسیر کے مطابق، تین طلاقوں کی ترتیب میں، پہلی دونوں بار کی طلاقوں کے بعد

امساک مطلوب ہے، تسریح نہیں۔ تین طلاقوں کے بعد تحریم کا حکم صرف اس صورت میں مرتب ہوگا، جب ان کے بعد، دو بار امساک ہو۔ اگر طلاق کے بعد تسریح و نکاحِ جدید واقع ہو تو تیسری طلاق کے بعد تحریم کا حکم مرتب نہیں ہوگا۔

تفسیر کا اختصار، یہ ہے: الف: امساک والی صورت میں: (طلاق-امساک)-(طلاق -امساک)- طلاق (تحریم) یعنی طلاق دی پھر امساک کیا، پھر طلاق دی اور امساک کیا۔ پھر تیسری طلاق دی۔ بیوی حرام ہوگئی۔ امساک کے معاملے کی حد تک، یہ صورت تفسیرِ اول کے مطابق ہے، اور صحیح ہے۔

ب: تسریح والی صورت میں: (طلاق-تسریح (نکاح) - (طلاق-تسریح (نکاح) - (طلاق-تسریح (نکاح) -چوتھی بار (طلاق-تسریح (نکاح) بلا نہایت۔ یعنی طلاق دی اور تسریح ہوئی، نیا نکاح کیا۔ پھر طلاق دی اور تسریح ہوئی، نیا نکاح کیا۔ پھر طلاق دی اور تسریح ہوئی، نیا نکاح کیا۔ پھر چوتھی بار طلاق دی اور تسریح ہوئی، نیا نکاح کیا۔ یہ سلسلہ بلا نہایت جاری رہے گا۔ اس تفسیر کی خاص بات یہی ہے۔

وضاحت: اس تفسیر میں، امساک اور تسریح کے عطفی رشتہ کو منقطع کر دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، حکمِ تحریم صرف امساک کے سلسلے میں ہے، اور تسریح کا ذکر محض امساک کے لزوم سے نفی کا فائدہ دینے کے لیے ہے۔ یہ تفسیر شاذ ہے اور مردود (غیر مقبول) ہے۔

سلسلۂ طلاقِ ثلاثہ میں تسریح کے بعد نکاحِ جدید کی تقدیر لازم ہے:

صحیح یہ ہے کہ دو یا تین طلاق والی ان صورتوں میں، جن میں طلاق کے بعد تسریح واقع ہوئی ہے، تسریح کے بعد، آگے کی طلاق کے وقوع نیز شمار کے لیے، نئے نکاح کو مقدر ماننا لازم ہے۔ یہ صورتیں بھی آیتِ مرتان کا مصداق ہیں۔

دلیلِ اول: اس کی دلیل یہ ہے کہ امساک معطوف علیہ ہے، اور تسریح معطوف ہے اور حکم میں امساک کا تابع ہے۔ یعنی علیٰ سبیل الخیار جو حکم امساک کے لیے ہوگا، وہی تسریح کے لیے ہوگا۔ کیوں کہ 'لا تحلُّ لہٗ' جس طرح 'لا امساک لہٗ' کا معنیٰ ادا کر رہا ہے، اسی طرح 'لا نکاح لہ' کا معنیٰ دے رہا ہے۔ بلکہ اصل معنیٰ یہی ہے۔ اور 'لا امساک لہ' ضمنی معنیٰ

ہے۔ یہ ضمنی معنیٰ ہی سیاقِ کلام کی رو سے متبادر معنیٰ ہے۔ مگر ضروری ہے کہ اصل معنیٰ یعنی 'لا نکاح له' کا مصداق بھی جملہ میں لازماً موجود ہو۔ اور وہ مصداق، تسریح کے بعد کا نکاح ہی ہوسکتا ہے۔ یہ معنیٰ عبارت کا اقتضاء اللغۃ (اقتضاء اللفظ) نیز اقتضاء النص ہے۔

دلیلِ ثانی: تیسری طلاق کے بعد 'فلا تحل لہ من بعد' کے حکم کا مفہومِ مخالف 'تحل له من قبل' ہے۔ یعنی تیسری سے پہلے پہلے ہر طلاق کے بعد عورت حلال رہے گی۔ یہ مفہومِ مخالف، مفہوم الشرط بھی ہے اور مفہوم العدد بھی۔ یہ مفہومِ مخالف جس طرح امساک کے لیے ہے، اسی طرح تسریح کے بعد نکاح کے لیے بھی۔ گویا تسریح کے بعد نکاحِ جدید کو مقدّر ماننا آیت کے مفہومِ مخالف کا اقتضاء ہے۔

دلیلِ ثالث: یہ بات کہ 'لا تحلّ لہٗ' کا ضمنی معنیٰ 'لا امساک له' تو مراد ہو، مگر اصلی معنیٰ 'لا نکاح له' مراد نہ ہو، یعنی 'لا تحل له' امساک (معطوف علیہ) سے تو متعلق ہو مگر اس کے معطوف یعنی تسریح سے متعلق نہ ہو، اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر صرف امساک سے متعلق کرنا مقصود ہوتا تو 'فلا تحل له' کی عام اور شامل تعبیر کے بجائے محض 'لا امساک لہٗ' یا اس کے ہم معنیٰ کوئی تعبیر اختیار کی جاتی، تاکہ تحریم کا حکم صرف امساک کے ساتھ خاص اور محدود رہے اور تسریح کے بعد نکاحِ جدید والی صورت سے غیر متعلق ہو جائے۔

غرض یہ ہے کہ تسریح کے بعد نکاحِ جدید اور اس کے بعد طلاق والی صورتیں بھی، امساک کی طرح، آیت کے معنیٰ کا مصداق ہیں۔ جس طرح آیت میں امساک کی تحدید دو بار میں کی گئی، اسی طرح نکاحِ جدید کی بھی تحدید کی گئی کہ اس کا موقع بھی دو بار ہے۔ اور درمیان کا نکاحِ جدید، سابق طلاق کی گنتی کو ساقط یا منہدم نہیں کرے گا۔ بلکہ نکاحِ جدید سے قبل کی طلاق بھی، طلاقِ ثلاثہ میں محسوب ہوگی اور تحریم کا حکم واقع ہوگا۔

گویا نکاحِ جدید کا، سابق طلاق کو محسوب کرنا، عطف کا تقاضا ہے۔ نیز اگر ایسا نہ ہوتا یعنی نکاحِ جدید، سابق طلاق کو محسوب نہ کرتا، تو امساک کے بعد والی طلاقوں اور نکاحِ جدید کے بعد والی طلاقوں کا حکم الگ الگ بیان کیا جاتا، اور نکاحِ جدید کے بعد، طلاق کی گنتی،

حرمتِ غلیظہ کے ساتھ، تین بار پرنہیں رکتی۔ بلکہ امساک کا عطفی رشتہ چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی۔اور تسریح و نکاح کا لا متناہی سلسلہ قائم رہتا، جیسا کہ اس تفسیرِ ثالث والوں کا خیال ہے۔

(۴) **تفسیرِ رابع**: طلاق محض دو بار ہے۔ پس (پہلی بار کی طلاق کے بعد) یا تو ایک امساک ہے یا ایک تسریح۔ پھر اگر (دوسری بار) طلاق دے تو بیوی حلال نہیں رہے گی۔

تفسیر کا اختصار، یہ ہے: (طلاق - امساک یا تسریح) - طلاق (تحریم)۔یعنی کل دو طلاقیں ہیں۔ایک طلاق کے بعد امساک یا تسریح ہے، دوسری طلاق کے بعد تحریم ہوگی۔

وضاحت: اس تفسیر کے مطابق، طلاقیں صرف دو بار ہیں۔ پہلی بار کی طلاق کے بعد امساک یا تسریح ہوگی۔اس کے بعد اگر دوسری طلاق دی تو تحریم ہو جائے گی۔تیسری بار طلاق کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ ایک شاذ تفسیر ہے۔ اس کو فقہاء و مفسرین نے بالاتفاق رد کر دیا ہے۔

(۵) **تفسیرِ خامس**: 'طلاق دو بار ہے۔ پس (دو بار طلاق دینے کے بعد) امساک ہے یا تسریح'۔آگے آیت کا مفہوم، اس تفسیر کے مطابق، اس طرح ہے: (**وَلاَ یَحِلُّ لَکُم اَن تَأخُذُوا** ...الیٰ آخرہ: یعنی تمھارے لیے، عورت کو دیے ہوئے مال سے کچھ واپس لینا حلال نہیں ہے۔اگر اندیشہ ہو کہ حدود اللہ قائم نہیں رکھ سکو گے تو عورت سے فدیہ لے کر رہا کر دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ پس عورت کے فدیہ دینے پر، '**فان طلقھا**' یعنی اگر شوہر اس کو طلاق دے تو وہ مفتد یہ عورت 'فلا تحل لہٗ' یعنی شوہر کے لیے حلال نہیں رہے گی)۔

اس تفسیر کا اختصار، یہ ہے: (طلاق - طلاق) -امساک یا تسریح (نکاح) - (افتداء- طلاق (تحریم) یعنی یکے بعد دیگرے دو طلاقیں دیں پھر امساک یا تسریح کی۔ پھر نیا نکاح کیا، پھر یکے بعد دیگرے دو طلاقیں دیں پھر امساک یا تسریح کی۔اس طرح یہ سلسلہ لا نہایت چل سکتا ہے۔'**فان طلقھا**' میں ھا کی ضمیر کا مرجع 'افتدت' میں ھی کی ضمیر ہے، یعنی مفتد یہ یا مختلعہ۔اور 'فان طلقھا' میں مذکور طلاق، 'فیما افتدت بہٖ' کی مفتد یہ (**مختلعہ**) سے متعلق ہے۔ اس تفسیر میں تیسری طلاق جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ شاذ رائے ہے۔ اس کو تمام فقہاء و

مفسرین نے رد کر دیا ہے۔

خلاصہ: دلائل کے اعتبار سے، مذکورہ بالا پانچوں تفاسیر میں سے صرف پہلی تفسیر صحیح ہے۔ جمہور نے دوسری تفسیر کو بھی جائز اور حسن قرار دیا ہے۔ آگے آیت کی تطبیق اور عملی مصداقات کا بیان، ہم صرف ان ہی دو (مقبول) تفسیروں کے مطابق کریں گے۔

(بقیہ اگلی قسط میں)

مفتی صباح الدین ملک فلاحی قاسمی
استاذ فقہ، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، اسلامی اکیڈمی دہلی انڈیا
ای میل: sabahkhalil1959@gmail.com
موبائل: 9570256290

آزاد ہندوستان میں وقف ایکٹ

خصوصیات اور نقائص: ایک جائزہ

عامر جمال، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ

تمہید و تعارف

وقف اسلامی قانون کا ایک اہم جز اور مسلمانوں کی ملی زندگی کا ایک روشن باب ہے۔ اسلام نے روز اول ہی سے فلاحی کاموں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں اصحاب ثروت مسلمانوں نے خیر کے کاموں کے لیے اپنی املاک میں سے دل کھول کر وقف کیا اور مدرسہ، خانقاہیں اور مساجد وغیرہ بڑی تعداد میں تعمیر کرائی ہیں۔

لغوی و اصطلاحی تحقیق

وقف، عربی مصدر ہے۔ اہل لغت کے نزدیک وقف دو افعال سے مشتق بتایا گیا ہے۔ ایک اوقف یوقف ایقافاً اور دوسرا وقف یقف وقفاً 1۔ جس کے لغوی معنیٰ قیام، ٹھہراو، روکنا، باز رکھنا، محفوظ رکھنا وغیرہ کے ہیں۔ جسے انگریزی میں Detention Stopping یا tying up کہا جاتا ہے: الوقف لغة الحبس و هو مصدر ثم اشتهر فی الموقوف (الدرمع الرد 3/357)

اصطلاحی طور پر وقف بمعنیٰ موقوف (وقف شدہ شئی) استعمال ہوتا ہے۔ اسے Endowment or Analieble Property کہنا چاہیے۔ جس سے مراد ایک ایسی

چیز ہے، جو خود کو قائم رکھتے ہوئے بعض منافع کا ذریعہ بنتی ہے اور جس کی خرید وفروخت پر اس کا مالکانہ حق ختم ہو جاتا ہے، یعنی کسی شئی کو اللہ کے لیے خاص کر دینا اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کو دوسروں پر مذہبی، خیراتی و خیری اغراض کے لیے نیک نیتی کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صدقہ کیے جانے کا نام وقف ہے۔ وقف اللہ کی ملکیت ہے۔ اس کی نوعیت دائمی اور نا قابل تنسیخ ہے۔

اسلام میں وقف کی تشریح مذہبی عطیات کے طور پر کیا جا سکتی ہے۔ جو کہ کسی عمارت، زمین اور مال کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ جس کو کسی دینی مقصد کے تحت ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لیے خرچ کیا جا سکے۔ وقف کا منشا صرف معاشرہ کے کمزور طبقات کی حاجت روائی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے مقصد ومنشاء میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا جائے گا اور ساتھ ہی صاحب ثروت لوگوں میں سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقات کے تئیں انسانیت کا جزبہ بیدار رہے۔ یہ ایسی مفید انسانی خدمت ہے جس کا فائدہ وقتی اور عارضی نہیں بلکہ واقف کے گزر جانے کے بعد بھی فائدہ اٹھایا جاتا رہتا ہے۔ اس طرح سماج سے غربت اور فقر وافلاس کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے اور محتاجوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہتی ہیں۔ قوم کے بچوں کو تعلیم اور ہنر سے آراستہ کیا جاتا ہے اور تعلیم گاہوں، تربیتی مراکز اور مساجد کے نظام کو اس کے ذریعہ استوار رکھا جاتا ہے، اسی طرح سماج کے مصارف خیر اور جائز ضرورتوں کو پوری کرنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔

تاریخ اسلام میں اوقاف

اسلامی تاریخ کے حوالے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وقف کرنے والوں میں سب سے پہلے شخص حضرت محمد ﷺ تھے۔ آپؐ نے ان سات باغوں کو وقف کیا جن کا مالک ایک یہودی (مخیرّیق) تھا۔ وہ جنگ احد میں مسلمانوں کی طرف سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اگر میں مارا جاؤں تو میری جائیداد حضرت محمد ﷺ کی ہوگی۔ وہ انھیں جہاں چاہیں خرچ کریں۔ (الاسعاف فی احکام الاوقاف، لبرہان الدین بن ابراہیم بن ابی بکر الطرابلسی: ص۹-۱۰) دوسرے وقف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق نے کیا

تھا۔ اس کے بعد آپؐ کے زمانے میں ہی دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی اپنی املاک وقف کیں۔ جب پیغمبرﷺ کے سامنے کوئی سماجی مسئلہ پیش آتا تو آپؐ صحابہ کرامؓ کو ترغیب دیتے اور وہ فوراً ضرورت کی چیزوں کو وقف کر دیتے۔

وقف کے احکام فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وقف کی اصطلاح بعد میں رائج ہوئی ہے مگر جائیدادوں کو وقف کرنے کا عمل ہمیں دورِ نبوی اور دورِ صحابہ میں بھی ملتا ہے مثلاً حضرت عثمانؓ کا بئر رومہ کو ایک یہودی سے خرید کر وقف کر دینا۔ عہد بنی امیہ میں کثرت سے اوقاف قائم کیے جاناحتی کہ ہشام بن عبد الملک کے زمانے میں اوقاف کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کے لیے ایک مستقل خصوصی ادارہ کا قیام ہونا، عہد عباسی میں اس میں مزید وسعت ہو کر دیوان سلطانی سے الگ ایک ادارہ دیوان الوقف کے نام سے بنایا جانا وغیرہ، اس کے مصارف میں وسعت دے کر ہاسپٹل، لائبریری، دار الترجمہ اور تعلیمی اداروں کو بھی شامل کیا جانا۔ پھر آگے چل کر خلافت عثمانیہ میں اوقاف پر خصوصی توجہ دی گئی، بنی عثمان کی خواتین نے بھی اس پر خصوصی توجہ دی اور وقف کی آمدنی کے مصارف میں مزید وسعت دی گئی۔ ساتھ ہی اس میں نئے زمانہ کی سائنسی ترقی کو دیکھتے ہوئے میڈیکل کالجز اور موجودہ ہاسپٹل کی طبی خدمات کو بھی شامل کیا گیا۔ موجودہ زمانے میں بھی مسلم ممالک میں مختلف میدانوں میں اوقاف قائم کرنے پر خصوصی توجہ و اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے باضابطہ وزارتیں قائم ہیں جو اوقاف کی ہمہ جہت ترقی میں ایک فعال کردار ادا کر رہے ہیں اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارے ملک میں اوقاف کی رجسٹرڈ جائیدادوں کی تعداد تقریباً ۵ لاکھ ہے۔ ان کا کل رقبہ تقریباً ۶۰ لاکھ ایکڑ پر مشتمل ہے۔ سرکاری حساب سے ان جائیدادوں کی مالیت ۶۰ ہزار کروڑ روپے ہے۔ افسوس کی اتنی بڑی اور قیمتی جائیدادوں کی آمدنی صرف ۱۶۳ کروڑ یعنی کل سرمائے کا ۲.۷ فیصد ہے۔

وقف کے عمومی مسائل جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:
واقف کو اپنی جائداد کی فروخت کا پورا حق حاصل ہو۔ وہ کامل ذہنی اور جسمانی قویٰ کا مالک ہو۔ عاقل، بالغ اور آزاد ہو۔ اسے وقف کی جانے والی چیز پر بلا کسی شرط کے ملکیت حاصل ہو۔

شئے موقوفہ مستقل (پائیدار) قسم کی چیز ہو اور اس سے منافع حصول ممکن ہو۔ گویا وہ بنیادی طور پر ایک صحیح اور قابل انتقاع جائیداد ہو۔ وقف کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہو اور یہ کہ کوئی چیز تحریری طور پر وقف کی گئی ہو وغیرہ۔

اسلام کے مالیاتی نظام میں وقف کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں مختلف مقاصد سے لوگ اپنی جائیدادیں وقف کرتے رہے، وقف کے من جملہ مقاصد میں غریبوں اور مسکینوں کی ضروریات پوری کرنا، انھیں معاشی طور پر خودکفیل بنانا، مسلمانوں کو علوم وفنون سے آراستہ کرنا، مریضوں اور پریشان حالوں کی حاجت روائی کرنا اور اصحاب علم وفضل کی معاشی کفالت کرنا وغیرہ شامل ہے۔

آزاد ہندوستان میں اوقاف

ہندوستان پر جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے بہت سی اوقاف کی املاک کو ضبط کرلیا اپنی ملکیت میں لے کر ان کی حیثیت کو ختم کردیا۔ انگریزی حکومت کی اس رویہ کو دیکھ کر دیگر لوگوں نے وقف شدہ املاک کو ہڑپنا شروع کردیا اور کرایہ دار کے بجائے اب ان کے مالک بن بیٹھے، جب وقف شدہ املاک کی بڑے پیمانے پر اس طرح غاصبانہ قبضہ دیکھ کر بعض مسلمانوں نے انگریزی حکومت سے تحفظ اوقاف کے لیے قانون وقف پاس کرنے کا مطالبہ کیا، چنانچہ اس سلسلے میں ۱۹۱۳ء سے وقف کے تحفظ وانتظام کے لیے مرکزی وصوبائی حکومتوں کے ذریعہ مختلف قوانین نافذ کیے گئے جس میں خاص طور سے The musalman waqf validating act,1913، ۱۹۲۳ء مسلم وقف ایکٹ اور The musalman waqf validating act,1930, نمایاں ہیں۔ آزادی کے بعد ۱۹۵۴ء میں ایک نیا وقف ایکٹ منظور ہوا۔ پھر مسلمانوں کے مطالبے پر ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۴ء، اور ۱۹۶۹ء میں وقف ایکٹ میں ترمیمات کی گئیں۔ لیکن ان ترمیمات کے باوجود یہ وقف ایکٹ قابل اطمینان نہیں تھا۔ اس ایکٹ میں ترمیم کے باوجود بھی کئی بنیادی خامیاں رہ گئی تھیں، جن کی وجہ سے اوقاف کی املاک کا تحفظ مشکل ہو رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۸۴ء میں نیا وقف بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا اور اسے منظوری حاصل ہوئی۔ لیکن اس قانون میں بھی بہت سے

نقائص تھے۔اس لیے مسلمانوں نے پھر سے وقف ایکٹ میں تبدیلی کرنے یا نیا وقف ایکٹ مرتب کیے جانے کا مطالبہ شروع کر دیا تا کہ اوقاف کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔ایک مدت کے بعد ۱۹۹۵ء میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے ''سنٹرل وقف ایکٹ ۱۹۹۵ء'' منظور کیا۔

اس طرح آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد اوقاف کے تعلق سے کئی قوانین پاس ہوئے، لیکن ان قوانین سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آسکے۔ وقف قانون ۱۹۹۵ء کے سلسلہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے بعض اعتراضات پیش کیے کیوں کہ اس میں متعدد ایسی کمزوریاں تھیں، جو وقف کے مفاد کے خلاف تھیں۔ بورڈ کی بار بار نمائندگی پر وقف قانون ۲۰۱۰ء بنا اور مسلمانوں سے مشورہ کے بغیر نہایت عجلت کے ساتھ اس کو پارلیمنٹ سے منظور کرالیا گیا، اس قانون کے تحت غیر مسلم راجاؤں کی طرف سے مسلمان رعایا کے لیے کیے گئے اوقاف وقف کے دائرہ سے باہر نکل گئے اور جن اوقاف کا باضابطہ رجسٹریشن نہ کرایا گیا ہو، بلکہ طویل مدت سے بطور وقف ان کا استعمال ہوتا آیا ہو، ایسے اوقاف کو ناجائز قابضین کے خلاف دعویٰ کرنے یا دفاع کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔

آزاد ہندوستان میں وقف ایکٹ

آزاد ہندوستان میں اوقف کی اہمیت اور امت کی اوقاف کے متعلق دینی حمیت کے پیش نظر وقتاً فوقتاً قانون سازی کی گئی، مگر حکومتوں کی نیتوں میں کھوٹ اور عدم سنجیدگی کا نتیجہ ہے کہ وہ ابھی تک ایسا ایکٹ بنانے میں قاصر رہی ہے جس سے تحفظ اوقاف کے مقاصد کو مکمل طور پر پورا کر سکے اوقاف کو درپیش چیلنجز س کا خاتمہ ممکن ہو اور ملت اسلامیہ کے ہمہ جہت ارتقا میں اوقاف کا مثبت کردار ہو سکے۔ ۱۹۹۵ء میں مرکزی حکومت کے ذریعہ پورے ملک میں واقع اوقاف کے بہتر اور یکساں نظام کے واسطے وقف ایکٹ ۱۹۹۵ء نافذ کیا گیا، جس کا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ضروری تبدیلیوں کا مسودہ پیش کیا۔حکومت نے ان تمام تبدیلیوں کو قبول کرنے کا وعدہ کیا۔اسی پس منظر میں مورخہ یکم نومبر ۲۰۱۳ء کو خاصی تبدیلیوں کے ساتھ وقف ترمیم ایکٹ ۲۰۱۳ء نافذ کر دیا گیا جو کہ موجودہ وقت تک رائج ہے۔ وقف ایکٹ ۲۰۱۳ء کی ترمیمات میں خاص کر فقرہ تعریفی میں Encroacher کی واضح

تعریف، وقف بورڈوں کی تشکیل کے معاملے میں چند اہم تبدیلیوں کا کیا جانا، چیئرمین معزولی کا طریقۂ کار، تمام ریاستوں میں اوقاف کا سروے اور وقف بورڈ کے قیام کا طریقہ، وقف جائیداد پٹے پر دیے جانے کے طریقۂ کار کی ضابطہ بندی، ٹربیونلوں کی کارکردگی کی بہتری کی خاطر ضروری توضیعات کی شمولیت اور وقف جائیدادوں کو ناجائز قبضوں سے آزادی والی دفعات کو مزید مؤثر بنایا جانا وغیرہ دفعات نمایاں ہیں، لیکن ابھی بھی یہ قانون بعض جہتوں سے ناقص ہے۔

۱۹۹۵ء وقف ایکٹ کی چند خصوصیات:

۱۔ وقف بورڈوں کی تشکیل میں مسلم تنظیموں کو نمائندگی دی گئی۔

۲۔ مسلم علماء کو نمائندگی دی گئی۔

۳۔ مسلم ممبران پارلیمنٹ کو نمائندگی دی گئی۔

۴۔ مسلم ممبران اسمبلی کو نمائندگی دی گئی۔

۵۔ مسلم وکلا کو نمائندگی دی گئی۔

۶۔ ایسے اوقاف جن کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ سے زائد تھی، کو نمائندگی دی گئی۔

۷۔ وقف کی فاضل آمدنی کو اس سے مشابہ مقصد میں یا غرباء کی مفاد میں یا مسلم طبقہ کے فروغ علم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۸۔ غیر مسلم حضرات کی طرف سے عطا کردہ املاک مساجد، عیدگاہ، امام باڑہ، خانقاہ، مقبرہ، مسلم قبرستان، سرائے یا مسافر خانہ وغیرہ کی شکل میں منقولہ یا غیر منقولہ عطیہ کی گئی ہو اس کو بھی اوقاف میں اس ایکٹ کے تحت شامل کیا گیا۔

۹۔ اوقاف کے مقدمات کے لیے خصوصی ٹربیونل کا قیام جس سے مقدامات کی سماعت میں جلدی ممکن ہو۔

۱۹۹۵ء وقف ایکٹ چند نقائص:

۱۔ وقف بورڈوں کے وسائل مقدمات کی پیروی کے لیے محدود ہوتے ہیں اور بالعموم ان کے وکلا اس قدر اہل نہیں ہوتے، جس قدر قابضین کے وکلا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وقف

بورڈوں کی پیروی کمزور ہوتی ہے اور اکثر مقدمات ہار جاتے ہیں۔

۲۔ وقف بورڈوں کو کوئی عدالتی اختیار حاصل نہیں ہے، اسے کلکٹر صاحبان کے ذریعہ اپنے اختیار کا استعمال کرنا ہوتا ہے۔

۳۔ ٹربیونل، وقف ایکٹ کی کوئی اتھارٹی نہیں ہے بلکہ ملکی عدلیہ کا ہی حصہ ہے۔ وقف بورڈس اس میں ایک فریق ہوتا ہے اور دوسرا فریق قابض شخصیت۔ جس کی وجہ سے ٹربیونل کا مقصد جلد مقدمات کی سماعت کا حصول آسان نہیں۔

۴۔ اگر وقف کے سلسلہ میں کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کے لیے ٹربیونل سے رجوع کیا جائے گا؛ لیکن ٹربیونل کے فیصلہ کے لیے کوئی مدت متعین نہیں کی گئی ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ نے حکومت سے خواہش کی تھی کہ ٹربیونل میں فیصلہ کی مدت چھ ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال ہو، اگر معاملہ نمٹانے کی کوئی مدت متعین نہ کی گئی تو وقف کے مقدمہ کو سرد خانے میں ڈال کر سالہا سال کھینچا جا سکتا ہے۔

۵۔ قانون Waqf property اور Property of waqf میں فرق کیا جاتا ہے اور وقف بورڈ کے ذریعہ خریدی گئیں جائیدادیں وقف شمار نہیں ہوتیں۔

۶۔ اکثر جائیدادیں Rent control Act اور پرانی آبادی انخلا ایکٹ کے تحت آنے کی وجہ سے ان املاک پر قابض کو بے دخل کرانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

۷۔ خود حکومتوں کے قبضہ سے وقف جائیدادوں کو آزاد کرانا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ حکومتی دفاتر کا قابض زمین سے ہٹانا تقریباً ناممکن سا ہو گیا ہے اور اسی طرح اس سے کرایہ بھی حاصل کرنا مشکل کام ہے۔ اس سلسلے میں ایکٹ خاموش ہے۔

۸۔ کاروباری منافع انکم ٹیکس سے مستثنی نہیں ہوتا جبکہ وقف جائیدادوں کی آمدنی مستثنی ہوتی ہے اس لیے کاروباری منافع وقف نہیں کیا جاتا۔ ہمدرد وقف اسی وجہ سے ختم ہو گیا اور اب وہ صرف ایک کاروبار ہے۔

۹۔ سروے نوٹیفکیشن کی غلطیوں کی اصلاح سے متعلق کسی بھی طریقہ کا ذکر ۹۵ کے ایکٹ میں نہیں ہے۔ الہ آباد میں دشمنی کی بنا پر کسی نے کسی شخص کی جائیداد کا نوٹیفکیشن کرا دیا۔

وقف بورڈ نے تصحیح کے لیے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ یہ کام اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ کمشنر وقف نے کہا کہ یہ اختیار صرف ٹربیونل کو ہی ہے چنانچہ وہ شخص پریشان ہے کہ اسکا نوٹیفکیشن ابھی تک کینسل نہیں ہوسکا۔ اس لیے اس سلسلے میں بھی ایکٹ میں وضاحت درکار ہے۔

۱۰۔ وقف قانون ۱۹۹۵ء کی دفعہ ۵۴ کے تحت ناجائز قبضے ہٹانے کی کارروائی کرنے کا آرڈر دینے کا حق وقف بورڈ کے CEO کو دیا گیا تھا، لیکن اس میں بھی ترمیم کی گئی۔ ایک تو قانون میں اس بات کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے جس کو ناجائز قبضہ کہیں گے۔ اوقاف کی جائیدادوں کے کرایہ دار جو برسہا برس معمولی کرایہ مثلاً ۱۰-۲۰ روپیہ ادا کر رہے ہیں، یا پھر اوقافی ملازمین نے ان کو بٹھایا ہے، یا پھر مقامی لیڈر نے بٹھایا ہے اس کو ناجائز قبضہ نہیں کہا جاسکتا۔ یا پھر جو معمولی کرایہ پر اوقافی املاک کا استعمال کر رہے ہیں ان سے مارکیٹ ریٹ کے حساب سے کرایہ وصول کیا جائے یا اس کا مطالبہ کیا جائے، اگر وہ انکار کر دیں تو اس کا قبضہ بھی ناجائز قرار دیا جائے، اس طرح غیر قانونی طریقہ سے کسی بھی قسم کی اجازت لیے بغیر وقف املاک کو منتقل کیا جائے، یا ان املاک پر قبضہ کیا جائے وہ ناجائز قبضہ کہلایا جائے گا۔

۱۱۔ اگر حکومت کسی موقوف شدہ جائیداد کو ایکوائر کرے گی تو مارکٹ کے ریٹ کے حساب سے اس کی قیمت ادا کرے گی، جبکہ گورنمنٹ نے ماضی قریب میں 'لینڈ ایکویزیشن ایکٹ' پاس کیا ہے، جس کے مطابق شہری جائیدادوں کا معاوضہ دوگنا اور دیہی جائیدادوں کا معاوضہ چار گنا دیا جائے گا، اس کا اطلاق وقف کی اراضی پر بھی ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ حکومت نے وقف بورڈ کا ڈھانچہ ایسا بنایا ہے کہ جس میں مسلمانوں کے منتخب نمائندے کم ہوگئے اور حکومت کے نامزد نمائندے زیادہ ہوگئے۔ مسلمانان ہند کو اب تک اس سلسلہ میں جو تلخ تجربہ ہوتا رہا ہے، اس کے تحت بجا طور پر وہ اس کو اپنے وقف جائیدادوں کے تحفظ کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اس لیے حکومت ہند کا فریضہ ہے کہ وہ موجودہ قانون وقف میں ایسی ترمیمات لائے جو سراپا انصاف پر مبنی ہو۔

عمل صالح کی ضرورت و افادیت

قرآن وسنت کی روشنی میں

فرحین اسرار، شعبۂ اردو شبلی نیشنل پی جی کالج، اعظم گڑھ

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو دو چیزوں پر مبنی قرار دیا ہے: (۱) ایمان (۲) عمل صالح۔ یہ دونوں لازم وملزوم کی حیثیت سے یکساں اہمیت رکھتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون۔ جس طرح کوئی عمارت، بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہوسکتی، ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے ورنہ ایمان بلاعمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی کردیتا ہے، جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں:

> ''ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے، جب تک بیج زمین میں نہ ہو کوئی درخت پیدا نہیں ہوسکتا لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا ہے، اسی بنا پر جتنی بھی بشارتیں قرآن پاک میں دی گئی ہیں انہی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لاکر عمل صالح کریں''۔(۱)

مختصراً اس کو ایک لفظ میں یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ عمل صالح کے بغیر ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَالْعَصْرِ ۔اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲)

(زمانہ گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے لیکن جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے......۔)

پوری تاریخ انسانی اس حقیقت پر شاہد ہے کہ ان ہی افراد اور قوموں پر فوز وفلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا، اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے۔

فرمان الٰہی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْر" غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (۳)

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اسے اُلٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ اُن کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔)

اس آیت کریمہ میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے لیکن بدترین منزل کی پستی سے وہی لوگ بچائے جاتے ہیں، جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہے۔

اللہ تعالٰی نے حکومت وسلطنت کا وعدہ انہی لوگوں سے کیا ہے جن میں ایمان کے ساتھ عمل موجود ہو۔ ارشاد باری تعالٰی ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ (۴)

(تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے خدا نے وعدہ کیا کہ ان

کوزمین کا مالک بنائے گا۔)

قرآن مجید میں معمولی فرق کے ساتھ پینتالیس (۴۵) مقامات پر'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'[جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے] آیت آئی ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم لازم وملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے۔ نجات اور فلاح وفوز کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے۔

نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

بادروا بالاعمال (الصالحة) فینا لقطع اللیل المظلم یصبح الرجل مؤمنًا ویمسی کافراً ویمسی مؤمناً ویصبح کافراً یبیع دینه بعرض من الدنیا. (۵)

(نیکیوں کو انجام دینے میں باہم ریس لگاؤ، تاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح آنے والے فتنوں کی وجہ سے جن کا شکار ہوکر ایک انسان مومن ہونے کی حالت میں صبح کرے گا اور شام تک کافر ہوجائے گا اور ایمان کی حالت میں شام کرے اور صبح تک کافر ہوجائے گا، دنیا کے معمولی نفع کے خاطر وہ اپنے دین کو بیچ دے گا۔)

درج بالا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نیک کاموں کو انجام دینے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرو، خیر کے کاموں میں مسابقت کے جذبات اپنے اندر پیدا کرو، ایسے فتنوں اور آزمائشوں کی وجہ سے جو اندھیری رات کے حصوں کی طرح ہوں گے، رات جب شروع ہوتی ہے اس میں اندھیرا کم ہوتا ہے، تاریکی اور ظلمت کے ماحول میں اتنی ہی زیادہ چھاتی چلی جاتی ہے، اگر آدمی رات کے شروع میں یہ سوچے کہ ابھی میں کام نہیں کروں گا، کچھ دیر کے بعد کرلوں گا تو کچھ دیر کے بعد جو وقت ہوگا وہ پہلے سے زیادہ تاریک ہوگا، اس لیے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کی قدر کرے اور اس کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا حاصل کرنے والے کاموں میں صرف کرے تاکہ وہ آخرت میں کامیاب و کامران ہوسکے۔

مذکورہ آیت کریمہ اور حدیث نبوی سے عمل صالح کی اہمیت وافادیت ثابت ہوتی اور یہ

بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ نجات کا انحصار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح بھی ہے۔

یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر تمام مذاہب میں افراط و تفریط نمایاں تھیں، نبی آخرالزماںؐ کے پیغام نے انسانیت کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر کامیابی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو، اس کو ایمان کہتے ہیں اور پھر ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست ہو، یہ عمل صالح ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ رقم طراز ہیں:

''کوئی مریض صرف طبی اصول کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل نہ کرے، اسی طرح اصول ایمان کو تسلیم کرلینا انسانی فوز وفلاح کے لیے کافی نہیں ہے جب تک ان اصولوں پر عمل نہ کیا جائے''۔(۶)

ارشاد خداوندی ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ. الَّـذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ صَلَا تِهِمۡ خَاشِعُوۡنَ. وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ. (۷)

(یقیناً فلاح پائی ہے ایمان والوں نے جو: اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، لغویات سے دور رہتے ہیں۔)

اس آیت سے واضح ہو رہا ہے کہ کامیاب صرف وہی اہل ایمان ہوں گے جو ایمان کے ساتھ درج بالا اعمال صالحہ پر عمل پیرا ہوں۔

عمل صالح کے فوائد

جزا اعمال کی دو صورتیں ہیں، ایک دنیوی جزا، دوسری اخروی جزا، ایک بندۂ مومن کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور اس دنیا (دارِ آخرت) میں بھی جزا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

فَاٰتٰـهُمُ اللّٰـهُ ثَـوَابَ الـدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۸)

(اللہ نے انہیں دنیا کا اجر دیا اور آخرت کا بہترین اجر بھی اور اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے۔)

دوسری جگہ فرمان الٰہی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۹)

(جس نے اچھا کام کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس حال میں کہ وہ مومن بھی ہو تو ہم اسے ایک پاکیزہ زندگی گزارنے کے تمام وسائل فراہم کریں گے اور دنیا کے کاموں پر ہم ان کا بہترین اجر انہیں عطا کریں گے۔)

مزید ارشاد ہے:

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۱۰)

(جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔)

فرمان خداوندی ہے:

اِنَّ الَّـذِيْـنَ اٰمَـنُـوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۱)

(جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، ان کا اجر بیشک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔)

ارشاد خداوندی ہے:

وَالَّـذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِـدِيْـنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ط وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (۱۲)

(اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، ہم عنقریب ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ ہمیش

رہیں گے، اللہ رب العزت کا یہ پکا وعدہ ہے، اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوسکتی ہے۔)

حدیث نبویؐ ہے:

قال رسول اللہﷺ: اذا مرض العبد أو سافر کتب له مثل ما کان یعمل مقیما صحیحاً. (۱۳)

(رسولؐ نے فرمایا، جب بندہ بیمار ہوتا ہے یا سفر کرتا ہے تو اس کا ثواب اس طرح لکھا جاتا ہے جیسا کہ وہ تندرستی کی حالت میں یا گھر میں عمل کرتا تھا۔)

رسولؐ کا یہ عمل انسانوں کے لیے اپنے آپ میں بہت بڑی خوش خبری رکھتا ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو نیک کاموں میں مداومت اختیار کرتے ہیں۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص کوئی عمل پابندی کے ساتھ کرتا ہے اور مستقل مزاجی کے ساتھ اچھائی کا پابند رہتا ہے تو نہ صرف یہ کہ دنیا میں اس کا وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے بلکہ آخرت کے اجر کے اعتبار سے جن دنوں میں وہ کام نہیں بھی کرتا ان دنوں کا اجر بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی اس کو اس کی جزاء دوہری دی جائے گی۔ اس حدیث مبارکہ سے اللہ تعالیٰ کی بے پناہ رحمت معلوم پڑتی ہے کہ کس قدر وہ اپنے بندوں کے کام اور نیک اعمال کا قدرداں ہے، جب کوئی بندہ کوئی کام خواہ وہ کام چھوٹا ہی کیوں نہ ہو مستقل طور پر کرتا ہے لیکن مجبوری کی وجہ سے اس میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے تو اس پر اجر کا ہاتھ روکا نہیں جاتا ہے۔ یعنی اس بندۂ مومن کو اجر ملتا چلا جاتا ہے۔ حدیث نبویؐ میں بڑی خوشخبری پنہاں ہے کہ کس قدر نیک کاموں میں ہمیشگی اور مداومت انسان کے لیے مفید ہے، اللہ رب العزت اپنے صالح بندوں کے عمل کی قدردانی کرتا ہے اور جب کسی اجر اور مجبوری کی وجہ سے وہ شخص یہ نیک اعمال بھی نہیں کرسکتا اس وقت بھی اس کو غیر حاضری کی وجہ سے اس کو اجر سے محروم نہیں رکھا جاتا بلکہ ان دنوں کا اجر بھی دیا جاتا ہے جن دنوں میں وہ نیک کام کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں کتنا رحمٰن ورحیم ہے، اسے بندوں کی عبادت کی کوئی حاجت نہیں لیکن جو بھی بندۂ مومن شوق کے ساتھ، محبت کے ساتھ، پابندی دوام کے ساتھ نیکی کرتا ہے اسے صالحین میں لکھ دیا جاتا ہے۔ ایک بندۂ

مومن کو مرتے دم تک عبادت کی تلقین کی گئی:

وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ (۱۴)

(اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔)

دوسری جگہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَّاَنۡ لَّوِ اسۡتَقَامُوۡا عَلَی الطَّرِیۡقَۃِ لَاَسۡقَیۡنٰھُمۡ مَّآءً غَدَقًا (۱۵)

(اور لوگ اگر راہ راست پر ثابت قدمی سے چلتے تو ہم انہیں خوب سیراب کرتے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص اچھے کام کو اختیار کرتا ہے اور اس راستے میں آنے والی مشکلات و مصائب سے گھبراتا نہیں ہے بلکہ اس پر جما رہتا ہے اور مستقل مزاجی کے ساتھ وہ کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر ایک خاص قسم کی خوشی اور سکون پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ بہت مطمئن ہو جاتا ہے۔

ایک مومن اور صالح بندوں کو دنیا کی زندگی میں ذلت، تنگی معاشرت، بے خوفی، بے اطمینانی کی جگہ عزت و سروری، فراخی رزق اور ذہنی اور قلبی اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے اور درج بالا آیات کریمہ اس بات کی بھی غمازی کر رہی ہیں کہ صالح مومن کے اعمال حسنہ کا اجر دنیا میں تو ملتا ہی ہے آخرت میں بھی وہ فوز وفلاح سے ہمکنار ہوگا۔

حواشی ومراجع

۱۔ تفہیم القرآن، مولانا مودودی، ج ۶، ص ۴۵۱
۲۔ سورۂ عصر: ۱ تا ۳
۳۔ سورۂ تین: ۴ تا ۶
۴۔ سورۂ نور: ۵۵
۵۔ صحیح مسلم
۶۔ سیرۃ النبیؐ، جلد ششم
۷۔ سورۂ مومنون: ۱ تا ۱۱
۸۔ سورۂ آل عمران: ۱۴۸
۹۔ سورۂ نحل: ۹۷
۱۰۔ سورۂ تین: ۶
۱۱۔ سورۂ بقرہ: ۷۷
۱۲۔ سورۂ نساء: ۱۲۲
۱۳ رواہ بخاری
۱۴۔ سورۂ حجرات: ۹۹

گزارش

معزز فلاحی برادران!

فروری ۲۰۱۹ء سے حیات نو تمام فلاحی برادران تک پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے، جن کے پوسٹل ایڈریس ہمارے پاس موجود ہیں اور جنھوں نے معلوماتی فارم پُر کرلیا ہے۔ جن فلاحی حضرات نے اب تک انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا معلوماتی فارم پُر نہیں کیا ہے، ان سے گزارش ہے کہ جلد از جلد فارم پُر کرلیں۔

حیات نو کو ڈاک کے نظام کے تحت لانے کی کوشش جاری ہے۔ ان شاء اللہ اس بات کی پوری کوشش کی جارہی ہے کہ آپ کو وقت پر اور پابندی کے ساتھ پرچہ موصول ہو۔

حیات نو اس وقت شدید خسارے میں ہے۔ آپ خود بھی اس کے سالانہ خریدار بنیں اور دیگر احباب کو بھی اس جانب متوجہ کریں۔

قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے حیات نو کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں ہے۔ فی الحال درج ذیل اکاؤنٹ میں اپنا سالانہ خریداری تعاون جمع کرکے درج ذیل واٹس اپ نمبر پر مکمل تفصیلات کی اطلاع دینے کی زحمت کریں۔ ان شاء اللہ رسید ای میل یا واٹس اپ کے ذریعہ آپ تک پہنچادی جائے گی۔ اکاؤنٹ کی تفصیل درج ذیل ہے:

Name:Abdul Hakim Mojahid

Bank: Union Bank of India

A.C No:584502010009509

IFSC:UBIN0558451

Branch:Jamia Nagar

ان امور سے متعلق مزید معلومات کے لیے درج ذیل ای میل اور موبائل نمبر پر رابطہ کریں:

ای میل:jareedahayatenau@gmail.com

موبائل:9015958467۔8010803147

[ادارہ]

طلبہ کے اندر علمی و تحقیقی ذوق کیسے پیدا کیا جائے؟

ذوالفقار علی فلاحی، اسلامی اسکالر نیپال

مدارسِ اسلامیہ کے قیام کا مقصد صرف درس و تدریس ہی نہیں ہے، بلکہ ان کا مقصد ایسے باصلاحیت افراد کی تربیت و تیاری ہے جو اپنے علمی وفکری ہتھیار سے دنیا کو اسلام کا گرویدہ بناسکیں۔ اسی لیے کوئی بھی مدرسہ ہواور کسی بھی مسلک ومشرب سے تعلق رکھتا ہو، صرف پڑھنے پڑھانے کو اپنے قیام کا مقصد نہیں بتاتا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مدارس کا قیام اشاعت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہوا ہے جن کا سلسلہ دار ارقم سے ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مرد وخواتین دونوں ہی میں دینی تعلیم کو سیکھنے سکھانے کی روایت ان مدارس کے قیام سے پہلے بھی قائم ہے۔

طلبہ کے اندر علمی اور تحقیقی ذوق پیدا کرنے کے لیے اختصار کے ساتھ چند نکات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں۔ ذمہ داران مدارس اگر ان پر توجہ دیں تو مذکورہ بالا مقاصد کے لحاظ سے افراد تیار کیے جاسکتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہر طالب علم کا ایک ایسا علمی گائڈ متعین کریں، جس کے اندر خود پاکیزہ ذوق مطالعہ اور علم کی پیاس موجود ہو اور جس سے قوی امید ہو کہ وہ ہر اعتبار سے علمی، فکری اور مطالعاتی رہنمائی کرسکتا ہو۔ اس کی رہنمائی میں طالب علم کا علمی سفر شروع کرائیں، خصوصا کتابوں کے مطالعہ کے انتخاب میں قدم قدم پر اس سے ہمیشہ رہنمائی لیتے رہیں، کیوں

کہ یہ راہ نہایت پر پیچ ہے، محض اپنے ذوق وفکر سے مطالعہ بسا اوقات آدمی کو منزل تک پہونچنے نہیں دیتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر طالب علم کو آمادہ کریں کہ صالحین میں سے وہ اپنے لیے ایک آئیڈیل اور نمونہ منتخب کرے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے اور کس کی طرح بننا چاہتا ہے؟ مثلاً اس کا ذوق علمِ حدیث ہے تو وہ کس محدث کی زندگی اور اس کے علم حدیث سے متاثر ہے، ایسے شخص کی زندگی کا مذکورہ طالب علم نہایت گہرائی سے مطالعہ کرے اور اس کی زندگی میں کیا چیزیں موثر ثابت ہوئی ہیں اور اس نے یہ مقام و مرتبہ کیوں کر حاصل کیا، اس کا سراغ لگائے، اور اپنی زندگی، عادات واطوار، علمی مشغولیت اور فکری نقطہ نظر کو اس کی زندگی کے حوالے کردے۔

تیسری بات یہ کہ وہ اپنے اوقات کو منظّم کرے، ہر وقت کے لیے ایک کام اور ہر کام کے لیے ایک وقت متعین کرے اور کوشش یہی ہو کہ ہر لمحہ اسی اسکیم کے مطابق وقت گزرے کہ:

قیمت دم حیات سے تو دام دام لے
بارش ہو یا خزاں ہو تو سب سے کام لے

چوتھی بات یہ ہے کہ وہ اپنی درسی کتب بینی کے علاوہ خارجی کتب کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور پڑھے اور یہ طے کرلے کہ پندرہ منٹ نیند میں تو تخفیف کی گنجائش ہو مگر مطالعہ مکمل ہونا چاہیے، اسی طرح حالات حاضرہ اور موجودہ سیاسی وسماجی حالات کو سمجھنے کے لیے بعض اخبارات اور معتبر رسائل وجرائد پر بھی نظر ڈالتے رہے کہ یہ بھی علم کا ایک حصہ ہے۔ بقول امام محمد بن حسن الشیبانیؒ ''**من لم يعرف أحوال زمانه فهو جاهل**''یعنی جو شخص اپنے زمانے کے حالات سے ناواقف ہو وہ علم کے ایک حصے سے محروم ہے، اس لیے اس کا علم بھی ضروری ہے تاکہ آئندہ علمی وعملی اور فکری ونظری زندگی میں تاریخ کا ایک حصہ ان کی نظروں میں رہے۔

پانچویں بات یہ کہ طلبہ کے اندر اپنے تمام اساتذہ، محبین، مخلصین، ادارے کے کارکنان، کتابیں، کاپیاں اور تمام وسائل علم کا حد درجہ ادب واحترام کا جذبہ پیدا کریں کہ

با ادب با نصیب بے ادب بے نصیب

چھٹی بات یہ کہ ہمیشہ طلبہ کے اندر علم کی پیاس کو بڑھانے اور اس کو سیراب کرنے کی فکر

میں لگے رہیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سچے طالب علم کے بارے میں کہا کہ ''صحیح طالب علم کی علامت یہ ہے کہ ہمیشہ اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی سوال ہو اور اس کے حل کے لئے وہ سرگرداں ہو''۔ اس پیاس کو بڑھانے کے لیے اکابر اہل علم کی صحبت اور اصحاب علم و دانش کی زندگی کا مطالعہ کیمیا سا اثر رکھتا ہے، اس کے لیے بھی انہیں آمادہ کرتے رہیں۔

ساتویں بات یہ کہ شروع سال میں انہیں یکسو کرانے اور علمی مقام و منصب کو سمجھانے کے لئے چند بنیادی کتابوں کا مطالعہ کرائیں۔ اس کے لیے مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تحریر: 'میری علمی و مطالعاتی زندگی' اور 'پا جا سراغ زندگی' کا مطالعہ مفید ہوگا۔ وقت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے معروف صاحب قلم ابن الحسن عباسیؒ کی شہرہ آفاق کتاب 'متاعِ وقت اور کاروان علم' کا پڑھنا نہایت مفید ہوگا۔ نیز علم دین کے تئیں صالحین کی محنت اور جد و جہد اور ان کی قربانیوں کو جاننے کے لیے شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی عربی کتاب ''**قیمة الزمن عند العلماء** '' اور ''**صفحات من صبر العلماء** '' اور اردو زبان میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ کی کتاب 'علمائے سلف یا نابینا علماء' کا مطالعہ اکسیر ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر یہ کتابیں ادارہ کی لائبریری میں نہ ہوں ہو تو ان کو وافر مقدار میں فراہم کرانا چاہیے۔

آٹھویں بات یہ کہ ماحول بنائے رکھیں کہ علم کی طلب کے تعلق سے ان کے اندر حیا اور بڑائی ہرگز نہ ہو، بلکہ وہ ہمیشہ خود کو علم کا محتاج سمجھیں، اس لیے اگر کوئی علمی بات کسی بڑے طالب علم کو معلوم ہو تو چھوٹا اس سے دریافت کرے اور چھوٹے کو معلوم ہو تو بڑا اس سے معلوم کرنے میں ہرگز شرم و عار محسوس نہ کرے۔

نویں بات یہ کہ موجودہ دنیا میں لسانی تغیرات کے پیش نظر اردو، عربی، انگلش اور ملکی پس منظر میں نیپالی زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے ان تمام زبانوں میں مہارت حاصل کرنا ناگزیر ہے تا کہ ان کے ذریعہ موثر انداز میں اپنی بات پوری دنیا تک پہونچا سکیں۔

دسویں بات یہ ہے کہ اپنے علم کو دل و دماغ ہی تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے اپنی عملی زندگی میں اتارتے چلے جائیں۔ علم کا مقصود اور اس کی اصلی زینت یہی ہے اور علم میں ترقی کے اہم ترین اسباب میں سے ایک بنیادی سبب ہے، اس سے علم محفوظ بھی ہوتا ہے اور پختہ بھی، اس

سے ذہنی وفکری گرہیں کھلتی بھی ہیں اور انسان خدا اور بندوں کی نگاہ میں معزز بھی ہوتا ہے۔ نیز ان کے اندر تعلق مع اللہ، اتباع سنت، سلف وخلف کا احترام، ماضی میں ہونے والی تمام دینی کوششوں کی مکمل قدردانی، اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے سب کچھ قربان کر دینے اور ظاہر وباطن دونوں لحاظ سے صبغۃ اللہ میں رنگ جانے کا ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا امور کی انجام دہی کے لیے درج ذیل امور کا اہتمام کیا جائے تو ان کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

☆ ایک نصاب تیار کیا جائے، جس میں عصر حاضر کے تمام اسلامی افکار ونظریات اور عالم اسلام کے اہم فکری وسیاسی مسائل کا گہرا مطالعہ شامل ہو۔ ساتھ ہی اسلامی تاریخ کی اہم شخصیات اور ان کے افکار وخدمات کا جائزہ بھی شامل نصاب ہو۔

☆ نیز اس نصاب میں تمام غیر اسلامی افکار اور اسلام مخالف تحریکات (سوشلزم، کمیونزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، فیمن ازم، ماسونیت، صہیونیت، برہمنیت، مشنریز، استشراق وغیرہ) کا گہرا مطالعہ اور ان کا علمی رد بھی شامل ہو۔

☆ اس نصاب میں قدیم اسلامی علمی مآخذ یعنی ہر فن کے اہم مراجع سے واقفیت بھی کرائی جائے اور جدید آلاتِ علم (نیٹ پر اہم علمی ویب سائٹس، کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ، ڈیجیٹل لائبریری، پروجیکٹر، آن لائن ٹیچنگ وغیرہ) کی بنیادی معلومات بھی پیش کی جائے۔

☆ زمانے سے واقفیت اور اپنی بات دنیا تک پہنچانے کے لیے الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا کے اہم چینلوں اور مرکزوں کا تعارف اور ان تینوں میڈیاؤں کے مثبت و تعمیری استعمال کی تربیت بھی دی جائے۔

☆ اوپر پیش کیے گئے دونوں نکتوں میں ذکر کی گئی چیزوں کی تربیت صرف زبانی نہ ہو، بلکہ طلبہ کو عملی تربیت دی جائے اور ایک متعینہ نظام کے تحت ان چیزوں کے درمیان کچھ وقت گزارنے کا موقع بھی دیا جائے۔

☆ یہ تعلیم وتربیت دو طریقوں سے ہو سکتی ہے۔

(الف) مطالعے اور تحریری وتقریری شکل میں مطالعے کے نتائج پیش کرنا۔

(ب) مختلف موضوعات کے ماہرین کے محاضرات یا لکچرز کا انعقاد کرنا۔

☆ ان کاموں کے لیے ایک مناسب بجٹ مختص کیا جائے، جسے محاضرین کی آمد و رفت، طلبہ کے تعلیمی و علمی دوروں، کتابوں اور دوسری تعلیمی چیزوں کی خریداری وغیرہ پر خرچ کیا جائے۔

☆ طلبہ کو تحریری مشق کرائی جائے اور جو علمی و تحقیقی مقالات وہ تیار کریں، انھیں حسب معیار ادارے کے ترجمان، ملک و بیرون ملک کے مجلّات میں شائع کرایا جائے۔

☆ طلبہ کے درمیان ہونے والے علمی مذاکرات یا جلسوں کی ویڈیو ریکارڈنگ کرائی جائے اور انھیں ممکنہ ذرائع سے عام کیا جائے۔(مقدم الذکران دونوں نکات سے دو اہم فائدے ہوں گے۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی اور امت کی علمی و دینی خدمت)

☆ طلبہ کو وقتاً فوقتاً اہم کتب خانوں، مختلف میدانوں کی اہم شخصیات، مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے سربراہان، میوزیموں، اہم جلسوں اور تاریخی مقامات میں لے کر جایا جائے۔

☆ طلبہ کی علمی و فکری تیاری پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ ان کے سامنے مستقبل کے ممکنہ معاشرتی، خاندانی اور مالی مسائل کو پیش کر کے واضح خاکہ بھی پیش کیا جائے کہ زندگی کے مسائل میں وہ اپنے دعوتی و فکری کاموں کو کس طرح جاری رکھیں۔

☆ ان سرگرمیوں کو انجام دینے والے طلبہ کو توصیفی سند سے نوازا جائے، تاکہ پورے حوصلے اور جذبے کے ساتھ اس کام کو انجام دیں اور اس میں وہ مہارت پیدا کریں۔

مضمون نویسی

اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کا یہ دوسرا طریقہ ہے بلکہ کہا جائے تو ایک پہلو سے یہی پائیدار اور قابل حوالہ طریقہ ہے۔ خطابت کے ذریعہ اظہار کیے گئے خیالات تو مٹ سکتے ہیں مگر قلم کے ذریعہ ظاہر کیے گئے خیالات ایک لحاظ سے دیرپا ہوتے ہیں۔ اسی لیے مضمون نویسی کی اپنی جگہ بہت ہی زیادہ اہمیت ہے۔

مضمون نویسی کے لیے کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آپ کا مطالعہ اور

مشاہدہ اچھا ہے اور آپ میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی تھوڑی سی بھی امنگ ہے تو آپ بھی دیر سویر 'مضمون نگار' کے طور پر متعارف ہو جائیں گے۔ اس کے لیے درج ذیل چند امور کو ذہن نشین کرنا ہوگا:

☆ سب سے پہلے موضوع کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ بہتر ہے کہ مضمون کا عنوان بھی منتخب کر لیں۔

☆ جو موضوع منتخب کریں، اس کے بارے میں مختلف دست یاب ذرائع سے مواد اکٹھا کریں۔ متعلقہ کتابوں سے، دوستوں/بزرگوں کے خیالات سے، اخبارات میں یا انٹرنیٹ پر اس موضوع پر شائع شدہ تحریروں کے تراشوں سے بھی مدد لی جائے۔

☆ مواد جمع کر لینے کے بعد لکھنے کی باری آتی ہے، لہٰذا اب لکھنا شروع کریں۔ اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ عموماً کسی بھی مضمون کے تین حصے ہوتے ہیں: دعویٰ، اسباب و وجوہات، دلیل اور نتیجہ!

دعویٰ: چونکہ یہ مضمون کا ابتدائی حصہ ہوتا ہے تو اس میں موضوع مختصر اور جامع ہونا ضروری ہے۔ تعارف اس قسم کا ہونا چاہیے کہ شروع ہی سے پڑھنے والی کی توجہ اپنی طرف راغب رکھے اور قاری کی دلچسپی قائم رہے۔ جو معلومات آپ نے اکٹھا کی ہیں، اس کو اختصار سے اور صاف صاف بیان کریں۔

اسباب و وجوہات: اس حصے میں وجوہات مناسب، شائستہ اور معقول ہونی ضروری ہیں اور مضمون کے عین مطابق بھی۔ ان دعووں کی دلیل کے طور پر اپنے نکتے ترتیب وار بیان کریں۔

ٹھوس دلائل: دلائل با قاعدہ تحقیق پر مبنی ہونے چاہئیں، کیوں کہ جس دور سے آج انسان کا تعلق ہے اس میں کسی بھی خبر کی تصدیق کرنا پلک جھپکتے ممکن ہے۔ لہٰذا اس امر کو ذہن میں رکھنا لازم ہے کہ دلیل مصدقہ ہو۔

اختتام: تمام دوسرے مندرجہ بالا عوامل بیان کرنے کے بعد اس اختتامیہ حصے میں موضوع کے مطابق واضح نکات پیش کریں، یہ پہلو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ اپنا

موقف واضح کرنا بھی ضروری ہے، اسی لیے اپنے دعووں اور دلائل کو سمیٹتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں، اُن کو ضبط تحریر میں لائیں۔

☆ جہاں تک ہو سکے مضمون کے موضوع کی تائید یا مخالفت میں یک طرفہ خیالات کی پیش کشی سے گریز کرنا چاہیے۔ دونوں طرح کے خیالات کے اظہار سے ہی قلم کی مشق حاصل ہوتی ہے۔

☆ جتنا ممکن ہو سکے سادگی اور سلاست سارے مضمون میں قائم رکھی جائے۔ اُلجھے ہوئے خیالات اور جذباتی شدت سے پرہیز کیا جانا چاہئے۔

☆ پوری کوشش ہونی چاہیے کہ صحیح اور درست زبان استعمال کی جائے۔

☆ ایک کامیاب مضمون نگار کی کامیابی یہی ہے کہ وہ اپنی پوری تحریر میں ربط وضبط کو برقرار رکھے اور پڑھنے والے کو محسوس ہو کہ لکھنے والے کی بات قابل فہم ہے!

حمد باری تعالیٰ

ذرے ذرے سے عیاں سطوت و شوکت تیری
پتے پتے سے ہویدا ہے شہادت تیری

کون ہے جس پہ نہیں چشمِ عنایت تیری
ثبت ہے ہر دلِ مومن پہ محبت تیری

میں یہی سوچ کے اٹھتا ہوں تہجد کے لیے
کچھ نہ کچھ مجھ کو مل جائے گی قربت تیری

تو صمد ہے تجھے کیا ہوگی کسی کی حاجت
ساری دنیا کو مگر رہتی ہے حاجت تیری

ماہ، خورشید، شجر، کوہ، بیاباں، دریا
سب کے سب کرتے ہیں اللہ! عبادت تیری

(**تابشؔ مہدی**، نئی دہلی)

نعت رسول ﷺ

مرے لبوں پہ جو نعت رسولؐ ہے بزمی
مری نگاہ میں دنیا فضول ہے بزمی

یہ صحن باغ یہ مہکا جو پھول ہے بزمی
بغیر لفظ کی نعت رسولؐ ہے بزمی

جہاں پہ ختم ہیں جبریلؑ کے پروں کی حدیں
وہاں سے آگے مقام رسولؐ ہے بزمی

کٹے سروں سے معطر ہوء فضائے فرات
یہ نخل گلشن زہرا بتول ہے بزمی

کہاں کہاں سے عقیدت تمہارے در کا غلام
نگاہِ ناز بڑا بے اصول ہے بزمی

حضور! حشر میں مل جائے آپ کا دامن
حضور! آپ کے قدموں کی دھول ہے بزمی

(**سرفراز بزمی**،سوائے مادھوپور،راجستھان)

غزل

وحشت غم سے رات بھر یارو
رویا میں پھر ہوئی سحر یارو

جانا چاہیں بھی تو کدھر جائیں
کھو گئے سارے رہ گزر یارو

ذہن و دل سے نکال کر اس کو
کر دیا خود کو معتبر یارو

عمر بھر گرد راہ کی صورت
میں جو کرتا رہا سفر یارو

آئی خاک وطن کی یاد مگر
لوٹ کر پھر گئے نہ گھر یارو

ہے تمنا نئی فضا کی مگر
کٹ گئے اپنے بال و پر یارو

چاہے جتنا خیال رکھو مرا
عمر میری ہے مختصر یارو

(**خان محمد رضوان**، نئی دہلی)

تعارف وتبصرہ

کتاب: دل کی دہلیز پر...
تخلیق: ہدایت اللہ خان شمسی
صفحات: ۲۵۶
قیمت: ۲۱۰/روپے
اشاعت: اپریل ۲۰۱۶ء
ناشر: گلستان ادب، اٹوا بازار، سدھارتھ نگر یوپی
تبصرہ: **سراج احمد برکت اللہ فلاحیؔ**

چنددنوں قبل ہدایت اللہ خان شمسیؔ کو جاننے والے ایک عزیز کے بدست یہ کتاب موصول ہوئی۔ مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ اس پر کچھ اپنے خیالات تحریر کروں۔ ارادہ تھا کہ ایک سرسری نظر دیکھ کر چندسطریں لکھ بھیجوں گا۔لیکن جب پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا اور سفر وحضر کی مصروفیات کے باوجود چار پانچ نشستوں میں ہی پوری کتاب پڑھ ڈالی۔

ہدایت اللہ خان شمسی، موضع دوپھڑیا، اٹوا بازار، سدھارتھ نگر کے رہنے والے ہیں۔ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ حافظ قرآن اور ایک سلفی عالم دین بھی ہیں۔ جامعہ سراج العلوم السفیہ جھنڈانگر نیپال، جامعہ ریاض العلوم دہلی سے ہوتے ہوئے مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ بنارس سے ۱۹۹۲ء میں فضیلت کی تعلیم مکمل کی ہے۔ پانچ چھ سالوں تک تدریسی خدمات سے بھی وابستہ رہے ہیں اوراس کے بعد بغرض روزگار سعودی عرب چلے گئے۔تقریبا پندرہ سولہ سالوں

کے بعد اب وطن ہی میں رہنے لگے ہیں اور تجارت میں مصروف ہیں۔

شمسی صاحب دوران طالب علمی سے ہی شاعری کا ذوق رکھتے ہیں لیکن مدرسہ میں تخلیقات شعری کا سلسلہ آگے نہ چل سکا۔ کیوں کہ انہیں ایسے استاد نہ مل سکے جو ادب اور شاعری میں ان کی رہ نمائی کرتے اور ان کی اس تخلیقی صلاحیت کو کوئی سمت دیتے بلکہ ہوا یہ کہ وہ خود اپنے ہی اساتذہ کے عتاب کا شکار ہوگئے اور یک لخت شاعری یا تک بندی بند کرنے پر مجبور ہوگئے۔

سعودی عرب میں ملازمت کے دوران شاعری کا ذوق پھر تازہ ہوا۔ پردیس کے غم بھلانے، دل کو بہلانے، دوستوں کی مجلس کو جمانے اور وقت گزاری کے لیے اچھی راہ نکالی۔ خود لکھتے ہیں کہ شاعری دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا ایک خوب صورت اور کامیاب طریقہ اور ذوق کی تسکین کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔(ص ۱۸) ۲۰۱۳ء سے سعودی یعنی پردیس میں رہ کر ہی شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا۔

''دل کی دہلیز پر....'' ہدایت اللہ خان شمسی کی غزلوں کا خوب صورت مجموعہ ہے۔اپنے والد محترم کے نام ''شمس اللہ خان'' سے شمسی تخلص اخذ کیا ہے۔ مطالعہ سے معلوم ہوا کہ خان شمسی گوں ناگوں خوبیوں کے مالک ہیں۔ ان کے اشعار ہمہ جہت تخلیقات یا تخیلات کا پتا دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں دنیا سے بے رغبتی کا درس ہے، حقیقت پسندی کو آواز دی گئی ہے، خودغرض اور مفاد پرست طبقہ پر کاری ضرب ہے، ظلم کے خلاف بولنے کی جرأت ہے، بے لوث دوستی اور بے غرض صلہ رحمی کا پیغام ہے، صرف ایک اللہ کے آگے سر جھکانے کی بات ہے، نظام باطل سے بغاوت ہے، مظلوم انسانیت کے لیے اٹھ کھڑا ہونے کی پکار ہے، اپنی اصلاح آپ کی صدا ہے، ساتھ ہی ہجر، وصل، گل، زلف وشباب یعنی عشق ومحبت اور پیار کی باتیں بھی حسین پیرائے اور دل نشین اسلوب میں موجود ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۷۳ غزلیں ہیں۔ متفرقات کے ضمن میں نعت، ترانہ، نظم ہیں جن کی تعداد ۱۶ ہے اور آخر میں بعض رباعیات بھی شامل ہیں۔

شاعری میں تو کشش ہر خاص وعام کے لیے ہوتی ہے۔ مجھے بھی شاعری پسند ہے لیکن

شعری ادب، فصاحت وبلاغت کا کوئی ذوق نہیں ہے کہ میں کوئی تبصرہ کروں۔ میں نے دوران مطالعہ محسوس کیا ہے کہ ان کے اشعار میں ادبی ذوق، اظہار بیان میں ایمان داری، بے ساختگی، روانی وسلاست، معنی ومطالب، پختہ علم دین، دینی رجحانات اور مشاہدات ہیں۔ اصلاح پسند شاعر ہیں، اپنے اشعار میں سماج میں موجود خرابیوں پر خوب نشتر چلائے ہیں اور جا بجا اصل بیماری پر انگلی رکھتے گئے ہیں۔

شمسی صاحب نئے شاعر ہیں لیکن ان کے اشعار میں پختگی ہے، ذوق اچھا ہے بیان پر بہت جلد قدرت پا گئے ہیں۔ اس لیے اب وہ نوخیز شعراء کی فہرست سے آگے جا چکے ہیں۔ مشہور شاعر عزیز بلگامی نے شعراء کو ان سے رجوع کا مشورہ دیا ہے۔ (ص ۲۸) ایک جگہ شمسی صاحب نے خود اپنی شاعری پر کہا ہے اور سچ کہا ہے:

شہر مظلوم کا سیماب صفت شاعر ہوں
آپ غزلوں کا میرے رنگ جدا دیکھیں گے

ان کے بعض اشعار میں مجھے عامر عثمانی کا لہجہ نظر آیا۔ ص ۹۵ پر کہا ہے:

دن رات تمہاری یادوں سے ہم زخم سنوارا کرتے ہیں
پردیس میں جیسے تیسے ہی اے دوست گزارا کرتے ہیں

اسی طرح ایک نظم کہی ہے: لوٹ چلو اب گھر کو اپنے، گھر ہے ہندوستان، بہت ہی زیادہ پسند آیا ہے۔ ان کے اشعار چھوٹے بحر میں بھی ہیں اور بڑے بحر میں بھی ہیں۔ طرحی مصرعوں پر کہے گئے اشعار بھی ہیں اور خود ساختہ و برجستہ بھی۔

مطالعہ کے دوران بعض اشعار بہت پسند آئے جیسے:

ص ۵۳: ہجر میں دن تو کسی طور گزر جاتے ہیں
جلنے لگتی ہے کبھی رات تو دکھ ہوتا ہے

ص ۵۵: صرصر کے موافق تو سفر سہل ہے شمسی
طوفان سے الجھنے کا مزہ اور ہی کچھ ہے

ص۵۶: ہر در پہ جھکے، ہر کام کرے اور غیرت بھی نیلام کرے
انسان خدا کے آگے کیوں سر اپنا جھکانا بھول گیا

ص۵۹: پڑھے نماز تو بدلے میں دولتیں مانگے
کرے یہ آج کا زاہد عبادتوں کا لہو

ص۶۶: کئی چہرے پس چہرہ لیے پھرتا ہے گلیوں میں
جہاں مطلوب ہو جیسا وہ چہرہ چھوڑ دیتا ہے

ص۶۸: ''خدا ہے ایک'' یہی کہہ رہے تھے لوگوں سے
یہی قصور تھا سولی پہ چڑھنے والوں کا

ص۷۵: کون کرتا ہے ادا حق مراسم شمسی
لوگ بس رسم نبھاتے ہیں چلے جاتے ہیں

ص۸۰: غربت میں کچھ بھی حسب ضرورت نہ کر سکے
بچے ہمارے کھل کے شرارت نہ کر سکے

میری رگوں میں خوں ہے کسی خرقہ پوش کا
ہم اپنے فکر و فن کی تجارت نہ کر سکے

ص۸۲: عہد ماضی سے حال کا لوگو!
کچھ نہ کچھ رابطہ ضروری ہے

سر پہ باندھو کفن چلو نکلو
ظلم کا خاتمہ ضروری ہے

ص ۱۰۵: تعلق جوڑنا رب سے بہت آسان ہے شمسی
اذاں سن کر تڑپ اٹھنا اور اس کے گھر چلے جانا

ص ۱۰۸: جب تلک تھے متحد نا قابل تسخیر تھے
اور جب بکھرے تو دشمن کے نوالے ہو گئے

ص ۲۲۲: گراں ہر شے ہے لیکن خوں کی ارزانی نہیں جاتی
جہاں میں قاتلوں کی اپنی من مانی نہیں جاتی

آغاز کتاب میں کئی اہل قلم کے تاثرات بھی ہیں۔ سراج عالم زخمی، امر روحانی پاکستان، افضل گوہر راؤ پاکستانی، عزیز بلگامی، ارم زہرا پاکستان، ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، عبدالاول سنگراہپوری، رشدی ندی۔ جنہوں نے ان کے اشعار کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان تاثرات واحساسات کو شامل اشاعت کرنے سے بھی مجموعہ کلام کی وقعت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اپریل ۲۰۱۶ ء میں شائع ہونے والا خان شمسی کا یہ مجموعہ بہت پسند کیا گیا ہے اور امید ہے جہاں تک یہ مجموعہ کلام پہنچے گا، اہل ذوق کی جانب سے شاعر کو خوب خوب داد و تحسین ملے گی اور وہ جلد ہی دوسری اور تیسری اشاعت پر مجبور ہوں گے۔

صاحب کتاب سے خواہش مند حضرات رابطہ کر سکتے ہیں۔ واٹس اپ نمبر: 00918601017720

●●

جامعہ کے لیل ونہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبہ اعلی، جامعۃ الفلاح
موبائل: 8565954119

تقریب یوم جمہوریہ

یومِ جمہوریہ کی مناسبت سے ۲۶/جنوری ۲۰۱۹ء بروز شنبہ ابواللیث ہال میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ محمد عمر اشرفی (عربی چہارم) کی تلاوت قرآن سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ ابو اسامہ فیصل نے ایک نظم پیش کی۔ صفی الرحمٰن نبیل (عربی ششم)، یاسر فہد بلال (عربی چہارم) نے یوم جمہوریہ کی مناسبت سے تقریریں کیں۔

جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی صاحب (نائب صدر مدرس) نے صدارتی خطاب کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، لیکن ہماری نمائندگی اس نظام میں بہت کم ہے۔ البتہ جیلوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ملک کو دوبارہ سیاسی و مذہبی آزادی کی ضرورت ہے۔ جو لوگ تاریخ نہیں پڑھتے وہ کوئی تاریخ رقم نہیں کر سکتے۔ ملک کے دستور کے مطابق ہمیں مثبت انداز میں کوشش کرنی چاہیے، علمی استعداد پیدا کرنا چاہیے، برادران وطن سے تعلقات استوار کرنا چاہیے اور ان کے ذہنوں میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس پروگرام کی نظامت کے فرائض عبدالرحمٰن (عربی اول) نے انجام دیے۔ جامعہ کے ابتدائی، ثانوی و حفظ میں بھی یوم جمہوریہ کی مناسبت سے پروگرام منعقد ہوئے اور بچوں کو مٹھائی تقسیم کی گئی۔

پروگرام کے آغاز سے پہلے ابواللیث وصدرالدین ہال کے سامنے بنے گنبد کے نزدیک ناظم جامعہ، جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب نے قومی پرچم لہرایا۔

جامعہ میں حفظ متون کا مسابقہ

تعطیل سرما سے پہلے طلبا و طالبات کے درمیان حفظ متون کے مسابقے کا اعلان کیا گیا۔ چنانچہ ٦/فروری ٢٠١٩ء، بروز چہارشنبہ مولانا صدرالدین ہال میں حفظ متون کا مسابقہ منعقد ہوا جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا گروپ: عربی اول — حفظ تحفۃ الاعراب

دوسرا گروپ: عربی دوم وسوم — حفظ حدیث (سومنتخب احادیث ریاض الصالحین سے)

تیسرا گروپ: عربی چہارم تا فضیلت — حفظ اصول حدیث (قصبۃ السکر نظم نخبۃ الفکر)

اس مسابقے میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کے علاوہ دیگر شرکاء کو بھی تشجیعی انعامات دیے جانے کا اعلان کیا گیا۔ انعامات کی تفصیل اس طرح تھی:

اول انعام: 2000 ہزارروپے نقد مع توصیفی سنداور کتب پر مشتمل ہوگا۔

دوم انعام: 1500 سوروپے۔

سوم انعام: 1000 ہزارروپے۔

اس مسابقے میں شریک طلبہ و طالبات کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

درجہ	طلبہ کی تعداد	طالبات کی تعداد
عربی اول:	٨	١٤
عربی دوم وسوم:	١٣	٢٠
عربی چہارم وپنجم:	٤	١٨
فضیلت:	١	٥

اس مسابقے کے رزلٹ کا ابھی اعلان نہیں ہوا ہے۔

ڈبیٹ بعنوان ’کیا ہندوستان میں اقامت دین ممکن ہے؟‘

جمیعۃ الطلبہ کی جانب سے ۱۴؍فروری ۲۰۱۹ء بروز پنجشنبہ کو ابوالليث ہال میں ایک ڈبیٹ بعنوان ’کیا ہندوستان میں اقامت دین ممکن ہے؟‘ کا انعقاد ہوا۔اس ڈبیٹ کا آغاز برادر داؤد حسین کشمیری (عربی پنجم) کی تلاوت قرآن سے ہوا۔نعت پاک یاسر فہد بلال (عربی چہارم) نے پیش کی ۔ڈبیٹ کو سات (۷) گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا،جس میں چار گروپ مثبت اور تین گروپ منفی میں تھے۔

مثبت گروپس کی فہرست درج ذیل ہے:

پہلا گروپ:	(۱)اسامہ احسن صدیقی	عربی چہارم (ب)
	(۲)محمد عمر اشرفی	عربی چہارم (ب)
دوسرا گروپ:	(۱)ابوسعید کشمیری	فضیلت، سال دوم
	(۲) کاشف اللہ	عربی ششم
تیسرا گروپ:	(۱)خالد سیف اللہ	عربی ششم
	(۲)محمد صارم ایوبی	عربی چہارم (الف)
چوتھا گروپ:	(۱)رمیز عالم	عربی ششم
	(۲)محمد روید	عربی پنجم (الف)

منفی گروپ کی فہرست مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا گروپ	(۱)صفی الرحمٰن نبیل	عربی ششم
	(۲)عبیداللہ ثناء اللہ	عربی ششم

دوسرا گروپ	(۱) آصف جاوید	فضیلت سال دوم
	(۲) طارق عزیز	عربی پنجم (الف)
تیسرا گروپ	(۱) اورنگ زیب	عربی پنجم (ب)
	(۲) محمد شاداب	عربی پنجم (الف)

اس ڈبیٹ میں حَکَم کے فرائض جناب مولانا عبدالعظیم فلاحی (نائب صدر مدرس) اور جناب مولانا عبدالرحمٰن ندوی صاحب نے انجام دیے۔

اس ڈبیٹ میں کوآرڈینیٹر کے فرائض سابق ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے انجام دیے۔

اس ڈبیٹ میں صرف دو پوزیشن دیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ چنانچہ منفی گروپ میں سے تیسرے گروپ نے پہلی پوزیشن حاصل کی جبکہ مثبت گروپ میں سے بھی تیسرے گروپ نے دوسرے پوزیشن حاصل کی۔ واضح رہے کہ ہر گروپ میں دو دو افراد شامل تھے۔

مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کے تشکرانہ کلمات سے پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

امیر جماعت اسلامی ہند و شیخ الجامعہ

مولانا سید جلال الدین عمری کی جامعہ میں آمد

امیر جماعت اسلامی ہند و شیخ الجامعہ جناب مولانا جلال الدین عمری صاحب حفظہ اللہ کی جامعہ میں آمد پر ایک ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔۳؍فروری ۲۰۱۹ء بروز یکشنبہ ابواللیث ہال میں طلبا کو خطاب کیا۔

پروگرام کا آغاز محمد عمر اشرفی کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔مہتم تعلیم و تربیت جناب مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے شیخ الجامعہ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ آپ عالم اسلام کی ایک اہم شخصیت ہیں اور ہندوستان کے ممتاز علماء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

شیخ الجامعہ نے اپنی تذکیر میں فرمایا کہ ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے۔اس ملک میں بہت سارے ادارے ہیں جس میں سے آپ نے جامعۃ الفلاح کا انتخاب کیا۔یہ محض اللہ کا فضل وکرم ہے۔اس لیے اساتذہ وطلبہ سب کو جامعہ کے اغراض و مقاصد کا ہمیشہ مطالعہ کرتے رہنا چاہیے۔

مولانا نے اپنی گفتگو میں مزید فرمایا کہ ہندوستان کی آبادی کی اکثریت اسلام سے ناواقف ہے اور غلط فہمیوں کا شکار ہے۔سوال یہ ہے کہ اسلام ان تک صحیح شکل میں کیسے پہنچے؟ پیغمبروں اور انبیاء کے آنے سے پہلے تو لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم کیسے زندگی گزاریں؟لیکن انبیاء کے آنے کے بعد یہ سوال بھی ختم ہو گیا۔انبیاء کی یہ ذمہ داری ہم پر عائد ہوگئی ہے۔کیوں کہ اب تو کوئی نبی یا پیغمبر آنے والا ہے نہیں۔

اب ان غلط فہمیوں کا ازالہ کون کرے گا؟اگر ہم نہیں کریں گے تو یہ غلط فہمیاں روز بروز بڑھتی ہی جائیں گی۔ہم لوگ اس ملک میں غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں ،تجارت کرتے

ہیں، پڑوسی ہیں ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، لیکن اب ان کو کون اسلام کی صحیح تصویر پیش کرے گا۔ یہ چیز ہمارے ڈسکشن، غور وفکر اور گفتگو کا موضوع ہونا چاہیے۔ دنیا کے مختلف موضوعات پر ہم لب کشائی کرتے ہیں، لیکن اس موضوع پر گفتگو کیوں نہیں کرتے اور اگر ہم اور آپ نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا تھا ''**الا ھل بلغت**'' (کیا میں پہنچا دیا؟) کیا ہمیں اس بات کی فکر ہے کہ ہندوستان کے ۱۳۵ کروڑ عوام تک اسلام کی صحیح تصویر کو کیسے پہنچایا جائے؟ حضرت موسیٰ نے جب دعوت پیش کی تو فرعون نے کہا یہ مجھے چیلنج کر رہا ہے، یہ تو مجنوں ہے۔ آپ سے بھی یہی کہا گیا کہ ''**ما انت بنعمة ربک لمجنون**''۔ آپ کو اسی اسوہ اور اسی جنون کی ضرورت ہے۔ دنیا کے سوالات کے مطابق آپ کو تیاری کرنی پڑے گی۔

شیخ الجامعہ نے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے آخر میں کہا کہ ہم یہ بیداری پیدا کریں کہ ہمارا مشن ہی اللہ کا پیغام پہونچانا ہے۔ آپ اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اسلام کی دعوت کو غیروں تک پہنچایئے، گفتگو اور لٹریچر کے ذریعہ یہ کام کیجیے اور دعوت کو اپنا موضوع بحث بنایئے۔ جو لوگ دنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے ہیں ان کے پاس بھی ۲۴ر گھنٹے ہوتے ہیں اور ہمارے پاس بھی ۲۴ر گھنٹے ہیں۔ اس لیے دین کے کام کو اپنے قول وعمل میں شامل کر لیجیے۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی صاحب کا جامعہ میں خصوصی خطاب

۲ر فروری ۲۰۱۹ء بروز شنبہ ابواللیث ہال میں ایک خصوصی خطاب مولانا ولی اللہ سعیدی فلاحی صاحب کا ایس آئی او فلاح یونٹ کی جانب سے منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز محمد ہاشم ۔راجستھان۔ (عربی دوم) کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ سعیدی صاحب کا تعارف صفی الرحمٰن نبیل (عربی ششم) نے کرایا۔

مولانا نے ایس آئی او کی جانب سے منعقدہ مہم 'تزکیہ نفس' کے عنوان پر طلبہ سے خطاب کیا۔انھوں نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ دنیا میں تربیت وتزکیہ یہ ہے کہ انسان کسی فن میں ماھر ہو جائے اور اُس کی خوب تعریف بیان کی جائے' دنیا میں اس کا نام ہو جائے ۔لیکن اسلامی تربیت وتزکیہ یہ ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو جائے ۔اسلامی تربیت وتزکیہ آخرت کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ دنیا کے لیے ۔تربیت وتزکیہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی حیثیت معلوم ہو جائے۔ جبکہ دنیا کی تربیت یہ ہے کہ وہ سب سے پرفیکٹ انسان بن جائے اور اس کی خوب مدح سرائی ہو۔ یہاں ایک تاجر اچھے اخلاق سے پیش آتا ہے ،مسلمان سے سلام اور ہندو سے نمسکار کرتا ہے، چائے پلاتا ہے اور اچھی خاطر کرتا ہے۔ روپے اگر زیادہ لے لیے تو فون کر کے واپس کر دیتا ہے تا کہ اس کا بزنس چلے۔ دنیا والے اس سے خوش ہوں ۔جبکہ دینی واسلامی تربیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جائے۔

مولانا نے اپنی گفتگو میں مزید فرمایا کہ جہنم میں جانے کے لیے بہت بڑے بڑے گناہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ حدیث میں ہے کہ جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اور روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔دل کی خطرناک بیماری حسد وکینہ اور بغض ہے ۔ہم اپنے دل کی زمین کو پہلے صاف کریں۔ ایک کسان زمین کی جوتائی ،صفائی اور نم کرتا ہے پھر دانا ڈالتا ہے، پھر پانی کھاد ڈالتا ہے اور نگہداشت کرتا ہے،تب جا کر فصل تیار ہوتی ہے ۔اس لیے ایمان کے پودے کے لیے دل کی صفائی ،ستھرائی ،محنت اور نگہداشت ضروری ہے ۔ہم فکر،نفس،اعمال اور دل کا تزکیہ کریں ۔حدیث میں آتا ہے کہ تین شخص ایسے ہوں گے جن کو اللہ کے سامنے لایا جائے گا اور اللہ حکم دے گا کہ سب کو جہنم میں ڈال دیا جائے کیوں کہ ان لوگوں نے اخلاص اور اللہ کی رضا وخوشنودی کے لیے نہیں بلکہ شہرت ،ریا کاری اور دکھاوے کے لیے اعمال کیے تھے۔

ہم اپنے اندر صلاحیت اور قابلیت پیدا کریں تا کہ اللہ کے دین کو سر بلند کرنے والوں میں سے ہو جائیں۔

جامعہ میں انجینئر جاویداحمد اعظمی کی آمد

۱۴/فروری ۲۰۱۹ء بروز پنجشنبہ ابواللیث ہال میں جناب انجینئر جاوید احمد صاحب کا ایک خصوصی لیکچر ہوا۔ مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے انجینئر جاوید احمد صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ کا تعلق اعظم گڑھ سے ہے اور اس وقت بھومنڈی میں قیام پذیر ہیں۔ جامعۃ الفلاح کی گولڈن جبلی میں ڈاکٹر ذاکر نائک کا تعارف آپ ہی نے پیش کیا تھا۔ موصوف کو دعوتی کاموں میں خصوصی دل چسپی کے ساتھ رفاہی اور اصلاحی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے ہیں۔

اعظمی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ دنیا بہت آگے جا چکی ہے، لیکن پھر بھی انسان نے کھانا کھانا نہیں چھوڑا۔ ہاتھ سے کام کرنا نہیں ترک کیا۔ آپ لوگ جب جامعہ سے فارغ ہوکر عملی میدان میں جائیں تو اسلام کے نمائندے کا رول ادا کریں۔ لوگوں کے اندر جو پیاس ہے اس پیاس کو آپ ہی بجھا سکتے ہیں۔

خطاب کے بعد طلبہ نے سوالات کیے اور مہمان موصوف نے ان سوالات کے تشفی بخش جوابات دیے۔

ماسٹر امتیاز احمد صاحب کے انتقال پر جامعہ میں تعزیتی نشست

۲۷ رجنوری ۲۰۱۹ء بروز یکشنبہ ابواللیث ہال میں ایک تعزیتی نشست ماسٹر امتیاز احمد صاحب (رکن شوری جامعۃ الفلاح) کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔ قاری اقبال احمد اصلاحی ندوی کی تلاوت قرآن مجید سے پروگرام کا آغاز ہوا۔

مولانا عمران فلاحی صاحب نے تعزیتی کلمات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ماسٹر امتیاز صاحب بہت ہی ملنسار شخص تھے، جماعت سے آخری سانس تک وابستہ رہے۔ ہر شخص ان کا احترام کرتا تھا اور دوسروں کا احترام کرتے تھے۔ مرحوم ہر دلعزیز تھے۔ جامعہ کی مجلس عاملہ میں بھی طویل عرصے تک رہے۔ ماسٹر صاحب کے دیار کے لوگوں کو ماسٹر صاحب سے کوئی شکایت

نہیں تھی ۔ان کی وفات جماعت کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے ۔اللہ تعالی ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اوران کے درجات کو بلند فرمائے۔

مولانا محمد طاہر مدنی صاحب (سابق ناظم جامعہ) نے اپنے تعزیتی کلمات میں فرمایا کہ ماسٹر امتیاز صاحب ایک ممتاز شخصیت کے حامل تھے۔تقریباً نوے سال کی عمر پائی شبلی کالج سے تعلیم حاصل کی پھر ایک کالج سے وابستہ ہوگئے۔ وہجماعت اسلامی کے بہت فعال اور سرگرام رکن تھے۔آس پاس کے علاقے میں تذکیر، درس قرآن کا اہتمام کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب سادگی پسند اور متواضع تھے۔ جامعہ کے مجلس شوری اور عاملہ کے بہت دنوں تک ممبر رہے۔ جامعہ اور جماعت اسلامی کی بہت فعال اور متحرک شخص تھے۔ چندروز قبل برین ہیمریج اور فالج کا اٹیک پڑا اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالی ان کی لغزشوں کو درگزر فرمائے ، جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

مہتمم تعلیم و تربیت مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب نے صدارتی گفتگو میں فرمایا کہ ماسٹر امتیاز صاحب ایک ملیّ شخصیت تھے۔ ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے دوران جماعت اسلامی کے گرفتار ہونے والے ارکان میں سے وہ بھی ایک تھے۔ ہر شخص مایوس تھا،لیکن ماسٹر امتیاز صاحب نے اس وقت ان حالات میں کہا کہ 'یہ سب وقتی آزمائش ہے'۔ ماسٹر صاحب قرآن وسنت کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے،لیکن ان حالات میں مایوس نہیں ہوئے اور دھیرے دھیرے حالات تبدیل گئے ۔حالاں کہ ایمرجنسی کے دوران ایسا لگتا تھا کہ اب حالات نہیں بدلیں گے۔ اللہ تعالیٰ ماسٹر صاحب کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کو درگزر فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

آخر میں ناظم جامعہ مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی مدنی صاحب نے اپنی گفتگو میں فرمایا کہ میں نے ماسٹر صاحب کو تین حیثیتوں سے پہچانا:(۱) جامعہ (جامعۃ الفلاح) کی وجہ سے (۲) جماعت اسلامی کی وجہ سے (۳) اور بحیثیت استاد کے۔

ماسٹر صاحب کے شاگردوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ان کے شاگرد ان کا کافی احترام کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کے بہت ہی سرگرم رکن تھے اور آخر دم تک تحریک اسلامی

کی خدمت کرتے رہے۔ جامعہ سے خاص تعلق تھا مجلس انتظامیہ (شوریٰ) کے رکن تھے۔ کبھی حالات سے گھبراتے نہیں تھے بہت ہی متوازن تھے، یہی وہ پہلو ہیں جن کی وجہ سے ماسٹر صاحب کی شخصیت ہر دل عزیز بنی۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کردے (آمین)

اس نشست میں نظامت کے فرائض جناب مولانا عبدالرحمٰن ندوی صاحب نے انجام دئے۔ شعبہ اعلیٰ، ثانوی، ابتدائی اور حفظ کے اساتذہ کرام نے اس نشست میں شرکت کی۔

شعبہ ثانوی کے استاذ ماسٹر سراج احمد صاحب کو صدمہ

۲ر فروری ۲۰۱۹ء، بروز شنبہ جامعہ کے شعبۂ ثانوی کے استاد ماسٹر سراج احمد صاحب کے فرزند ارجمند جاوید احمد فلاحی اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون

مرحوم جاوید احمد فلاحی کی عمر ۴۰ر سال تھی۔ جامعۃ الفلاح سے عالمیت کی تکمیل کی تھی مرحوم کا ایک بارہ سال کا بیٹا ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے (آمین)

انجمن طلبۂ قدیم دہلی یونٹ کی میٹنگ

۳ر فروری ۲۰۱۹ء کو مرکز جماعت اسلامی ہند کی مسجد میں انجمن طلبہ قدیم دہلی یونٹ کی شوریٰ کی نشست منعقد ہوئی۔ جس میں مندرجہ ذیل ایجنڈے شامل تھے:

۱۔ حیات نو کی اشاعت میں اضافہ
۲۔ انجمن ہاسٹل کی تعمیر کے لیے مالی معاونت
۳۔ نو وارد طلبہ کے مسائل کا حل
۴۔ دہلی یونٹ کی جانب سے طلبا کو اسکالرشپ
۵۔ مادر علمی میں تعلیمی بہتری

صدر حلقہ دہلی یونٹ، جناب نور اللہ خان فلاحی کے زیر صدارت شوریٰ کے مشورے سے اس میٹنگ میں درج ذیل فیصلے کیے گئے:

ا۔ ڈاکٹر زاہد احسن فلاحی کو حیات نو کی اشاعت، ممبر سازی وغیرہ کے لیے کوآرڈی نیٹر بنایا گیا۔

۲۔انجمن ہاسٹل کے مالی تعاون کے لیے مہم چلائی جائے گی۔

۳۔ نئے طلبہ کے لیے کاؤنسلنگ کی جائے گی۔

۴۔ایمرجنسی فنڈ کا قیام کیا جائے گا۔

آخر میں جناب نور اللہ خان صدر حلقہ انجمن طلبۂ قدیم دہلی، نے تمام لوگوں سے پر خلوص تعاون کی درخواست ہے تاکہ نئے طلبہ کی تعلیمی رہنمائی کے ساتھ انجمن ہاسٹل کے مالی تعاون کو بھی یقینی بنایا جاسکے اور باہمی اتحاد بامعنی بن کر مادر علمی کے حق میں مفید تر ہو سکے۔

ڈاکٹر غالب نشتر کی بحالی

جامعۃ الفلاح کے خیر خواہوں کے لیے یہ بات پُر مسرت ہے کہ ڈاکٹر غالب نشتر فلاحی (رانچی) کو وزیر اعلیٰ رگھور داس نے ہائی اسکول چندوا میں بحالی کا پروانہ سونپ دیا ہے۔ان کی بحالی کی اطلاع ملتے ہی اردو حلقہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر وکیل احمد رضوی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بے شک غالب نشتر اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس لائق ہیں کہ انہیں یونیورسٹی میں خدمت کا موقع ملنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر غالب مقامی ڈورنڈا کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے اعزازی عہدے پر فائز تھے۔صدر انجمن جناب مشرف حسین صدیقی صاحب اور سکریٹری انجمن جناب انعام اللہ فلاحی صاحب نے بھی برادر موصوف کو مبارک باد پیش کی۔

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی

علی گڑھ

تحریک اسلامی کے ذمہ داروں کی راست نگرانی میں گزشتہ ۳۸ ربرسوں سے علم وتحقیق کے میدان میں اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔

- اس کے کارکنوں کی تیار کردہ چار درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔
- اس کا ترجمان سہ ماہی تحقیقات اسلامی ۱۹۸۲ء سے پابندی سے نکل رہا ہے اور اسے عالمی سطح پر مقبولیت حاصل ہے۔
- اس کے تصنیفی تربیت کورس سے استفادہ کرنے والے ملک و بیرون ملک میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

گزارش ہے کہ ادارہ کے علمی کاموں کی سرپرستی فرمائیں اور اس کا مالی تعاون کریں۔

(ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی) سکریٹری

9582050234

IDARA-E-TAHQEEQ-O-ETASNEEF-E-ISLAMI

Central Bank of India , Dodh Pur Br., Aligarh

A/C No.1214740843 , IFSC Code:CBIN0281291

JARIDA HAYAT E NAU

RNI No: DELURD/2015/65862

February-2019

Vol. IV Issue-II

انجمن ہاسٹل کی تعمیر مرحلہ بہ مرحلہ